www.shibliinternational.com

December 2019

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

علامہ شبلی نعمانی

مولانا ابوالکلام آزاد

علامہ اقبال

مولانا اسماعیل میرٹھی

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

دسمبر: Dec :2019 | علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار | جلد Vol2۔شمارہ: Issue22

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابو ہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامیؔ
پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر
فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مولانا احمد نور عینی
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابو ہریرہ ایوبی، محسن خان

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661- 8317692718

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC CODE: IBKL0001327
IDBI BANK, CHARMINAR HYD, TS

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ (قسط:۱۸)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸
۴	بابری مسجد کے آنسو (نظم)	ڈاکٹر مسعود جعفری	۱۰
۵	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۱
۶	مسلم بچوں کے تعلیمی مسائل اور مدارس کی موجودہ صورتِ حال	مفتی امانت علی قاسمی	۱۳
۷	غزل	عطیہ پروین بلگرامی	۱۶
۸	شبلی خودنوشتوں میں: ایک مطالعہ	حکیم وسیم احمد	۱۷
۹	بابری مسجد کے نام/ پرینکا رڈی (نظم)	عروسہ عرشی	۲۳
۱۰	مولانا آزاد کی سیاسی کیمیا	ڈاکٹر مسعود جعفری	۲۴
۱۱	اقبال فہمی	احمد نور عینی	۲۷
۱۲	زنا کی مذمت قرآن وحدیث کی روشنی میں	ڈاکٹر مفتیہ شکیل خان	۳۰
۱۳	آخری خواہش (افسانہ)	محمد شبلی آزاد	۳۳
۱۴	اقبال کا تصورِ عشق وعقل	عطیہ نفیس	۳۶
۱۵	ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ثنا غزل	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغاپورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

ہمارا ملک ہمہ مذہبی، ہمہ لسانی جمہوری ملک ہے۔ اس ملک کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں پر سب سے زیادہ مذاہب کے ماننے والے، ذاتیں، بولیاں، تہذیبیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ اس ملک کے دستور کی روح سیکولرزم پر ہے، اس کی روح یعنی آئین ہند کی دفعات نے تمام فرقوں کو عقیدہ، اخوت، عبادت، سیاسی، معاشی، سماجی، انصاف اور مساوات کا حق دیا ہے، لیکن اب اس ملک کا منظر نامہ بدل رہا ہے، کیونکہ برسر اقتدار حکومت کھلے عام طاقت کا استعمال کر رہی ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے حق اور عدل کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ بہت سارے قد آور پڑھے لکھے مذہبی سیاسی رہنما اور اپوزیشن لیڈر صرف دلائل دے رہے ہیں کہ یہ آئین ہند کے خلاف ہے اور ہمارے صدر جمہوریہ صاحب ہر بل پر کسی کی پرواہ کئے بغیر چاہے ملک میں احتجاجی کیفیت ہو یا کرفیو زدہ ماحول ہو، آناً فاناً دستخط کرتے چلے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہاں کا مسلمان اور باشعور طبقہ بہت دکھی ہے اور دنیا کے دانشوروں کی نگاہ میں ہندوستان کا قد سرنگوں ہو رہا ہے۔ موجودہ دور کے طرز حکمرانی پر یہ شعر صادق آ رہا ہے کہ ۔

جو اصول گلستاں سے واقف نہ تھے
نظام چمن ان کے ہاتھ آگیا

دیکھتے جایئے آگے آگے کیا ہوتا ہے؟ لیکن اتنی تو بات طے ہے کہ ظلم وجور کی عمر کم ہوتی ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں ہندو راجاؤں، مسلمان حکمرانوں اور انگریزوں نے حکومت کی۔ انگریزوں سے آزاد کرانے میں ہندو مسلم نے مل جل کر نمایاں کردار ادا کیا، جو کہ تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ہمارے ملک کے دستور میں یہ لکھا گیا ہے کہ پہلے ہم سب ہندوستانی ہیں اور ہماری کثرت میں وحدت کا راز پنہاں ہے، مگر آج نفرت کی دیوار حائل ہوگئی اور حالیہ چند سالوں میں ہجومی تشدد، لو جہاد، زنا بالجبر، قتل، طلاق ثلاثہ کا بل، بابری مسجد کا غیر منصفانہ فیصلہ اور شہری ترمیمی بل وغیرہ جیسے معاملوں نے ملک کے سیکولر لوگوں اور مسلمانوں کو حاشیے پر ڈال دیا ہے، بالخصوص مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا یہ ملک ہمارے لیے دارالحرب بن گیا؟ حالانکہ آزادی کے بعد ہندوستان کے بیشتر مسلمان اسے دارالامن مان رہے تھے، اب تک مسلمان اس ملک کے دستور پر، عدالت پر، حکومت پر کامل اعتماد کئے ہوئے تھے، لیکن حالیہ کے واقعات نے ان کے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے اور ان کا ضمیر یہ بار بار کہہ رہا ہے کہ جائیں تو کہاں جائیں، لیکن یاد رکھنا چاہئے خاص طور سے مسلمانوں کو کہ ہمارا مذہب مایوسی کی تعلیم نہیں دیتا ہے بلکہ یہ بتاتا ہے کہ تنگیوں کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں ''اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا کوئی حامی وناصر نہیں ہوگا'' ہم اپنی تعلیمی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں میں مزید آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور برادران وطن کی نفرت کا جواب نفرت سے نہ دیں، اس لیے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، برائی کو بھلائی سے ہی دفع کیا جا سکتا ہے۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام ہفت لسانی دو روزہ عالمی سیمینار 'اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، تلگو، تامل نثری زبان وادب میں ذات رسولؐ وصفات رسولؐ' کے کامیاب ہونے پر ادارہ مبارکباد دینے والوں اور معاونین ومحبین کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہے اور امید ہے کہ سبھی لوگوں کا اسی طرح سے ادارے کے ساتھ تعاون جاری رہے گا۔

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

(ابتدائے ہجرت میں خود آنحضرت ﷺ اور تمام مہاجرین انصار کے گھر میں مہمان رہے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی، مقدادؓ بن الاسود کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جس میں خود آنحضرت ﷺ شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں، جن کے دودھ پر گذارا تھا، دودھ دوہ چکا تھا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے اور آپؐ کے لیے پیالہ میں چھوڑ دیتے، ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی، لوگ دودھ پی پی کر سو رہے، آپؐ نے آکر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا خدایا، جو آج کھلاوے اس کو تو بھی کھلا دینا، حضرت مقدادؓ چھری لے کر کھڑے ہوئے کہ بکری ذبح کر کے گوشت پکائیں، آپؐ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دُہ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی۔)

ابو شعیبؓ ایک انصاری تھے، ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا، ایک دن ہ خدمت اقدس میں آئے، آپؐ صحابہؓ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا، ابو شعیبؓ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو، کھانا تیار ہو چکا تو آنحضرت ﷺ سے درخواست کی، صحابہؓ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں، کل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہولیا، آنحضرت ﷺ نے ابو شعیبؓ سے کہا کہ یہ شخص بے کہے ساتھ ہولیا ہے، تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے، ورنہ رخصت کر دیا جائے، انہوں نے کہا آپؐ ان کو بھی ساتھ لائیں۔

عقبہ بن عامرؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ پہاڑ کے درہ میں اونٹ پر سوار جا رہے تھے، یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کہا ''آؤ سوار ہولو'' انہوں نے اس کو گستاخی سمجھا کہ رسول اللہ کو پیادہ بنا کر خود سوار ہوں، آنحضرت ﷺ نے دوبارہ کہا اب انکار کرنا امتثالِ امر کے خلاف تھا، آنحضرت ﷺ اتر پڑے اور یہ سوار ہو لیے۔

مجالس صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت زینبؓ سے جب نکاح ہوا اور دعوت ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور حضرت زینبؓ بھی مجلس میں شریک تھیں، آپؐ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال کیا، آپ اٹھ کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ تک گئے، واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے اور دوبارہ تشریف لائے، پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری۔

غزوۂ حنین سے واپس آ رہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آ گیا، حسب دستور ٹھہر گئے، مؤذن اذان دی، ابو محذورہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سن کر سب نے چلا چلا کر استہزا کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی، آنحضرت ﷺ نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی، ابو محذورہؓ خوش لحن تھے، ان کی آواز پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کے لیے دعا کی، پھر ان کو اذان سکھلا کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ، اسی طرح حرم میں اذان دیا کرنا۔

قسط:(۱۹)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

مشتاق حسین

مشتاق حسین سابق اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نے ''باقیات شبلی'' مرتب کی جسے آزاد کتاب گھر دہلی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کی وہ تحریریں جمع کی گئی ہیں جو مقالات وخطبات اور مکاتیب شبلی کی ۱۱ر جلدوں کے بعد دریافت ہوئیں۔ یقیناً یہ شبلیات میں ایک اہم اضافہ تھا۔ اس کتاب پر مشتاق حسین مرحوم نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ بھی کم اہم نہیں، اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کے بارے میں آج سے پچیس تیس سال قبل مولوی عبدالحق صاحب کا یہ فقرہ موضوع بحث بنا ہوا تھا کہ ان کی کتابوں کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ آنے والا زمانہ خود اس نزاع کا اس طور پر فیصلہ کرے گا کہ پرستار حالی کو اپنے اس فقرے کے لئے طرح طرح سے معذرتی انداز اختیار کرنا پڑے گا۔ اس کی تصدیق کرنی ہو تو اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مولوی عبدالحق کا شبلی پر مضمون اور رسالہ ادیب کے شبلی نمبر میں ان کا خط ملاحظہ کیا جائے''۔

(باقیات شبلی ص ۱۱)

مشتاق حسین صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ

''دراصل شبلی ہماری زبان کے ان ادیبوں میں سے ہیں جن کو پسند کرنا یا یہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے لیکن ان کی شخصیت کو نظر انداز کر کے ہماری فکری اور تہذیبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ بقول شخصے وہ اپنی جگہ پر خود ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان پر تحقیق وتنقید، تجزیہ ومحاکمہ، تحسین وآفرین، اور تنقیص وتعریض کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا بلکہ ان میں اضافہ کی گنجائش باقی رہے گی''۔ (ایضا ص ۱۲)

مقدمہ لکھتے ہوئے باقیات شبلی کے مرتب کو احساس تھا کہ شبلی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور وہ اس کی یہ وجہ بتاتے کہ:

''شبلی کی شخصیت میں جامعیت ہے۔ ان کے سماجی اور ادبی کردار پہلودار ہیں اور ان میں ایک طرح کی رنگارنگی ہے۔ ہمارے تنقید نگار دراصل ان کی اس خصوصیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس لئے یک طرفہ نتائج نکالتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی سیرت اور ان کے تصنیفی وعلمی کاموں کے ہر گوشہ کو بے نقاب کیا جائے تاکہ ان کے ساتھ صحیح معنوں میں انصاف کیا جاسکے۔ (ایضا ص ۱۲)

علامہ شبلی کی عظمت ومقبولیت کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''ان کی سرشت میں قدرت نے ایچ اور انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی اور اپنی انفرادیت کی تشکیل وتعمیر ہی ان کی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ شبلی کے یہاں

کسی مرحلہ میں جمود اور سکون نہیں ملتا.....

ہاں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان تمام شکوہ سرائیوں کے باوجود جو شبلی کو اپنائے زمانہ سے رہیں، وہ اپنے عہد کے خوش قسمت افراد میں سے تھے، شبلی کی بارگاہ میں قدیم مکتبہ خیال سے تعلق اور شفقت رکھنے والا گروہ ہو یا جدید علوم وفلسفہ کا دلدادہ طبقہ دونوں نے خراج عقیدت پیش کیا، شبلی کے علمی فضل وکمال کا اعتراف کیا، خدمات کو سراہا اور شبلی کی ہر آواز پر لبیک کہا۔

شبلی نے ہمارے اس علمی احساس کمتری کو جو یورپ کی بدولت ہم میں پیدا ہوگیا تھا دور کیا۔ تخلیق ہو تنقید، تحقیق ہو یا تذکرہ ہر ایک کا معیار بلند کیا، شبلی علمی معیار ومذاق کی پستی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے"۔ (ایضاص ۱۳-۱۴)

میمونہ سلطان شاہ بانو

فرماں روائے بھوپال نواب حمید اللہ خاں (۱۸۹۴-۱۹۶۰ء) کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو نے علامہ شبلی کے عربی رسالہ "بدء الاسلام" کا اردو ترجمہ "آغاز اسلام" کے نام سے کیا جو مطبع سلطانی بھوپال سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن سیرت طیبہ کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں یونیورسل بکس لاہور نے شائع کیا، میرے پیش نظر طبع اول آغاز اسلام ہے۔ اس میں وہ گذارش کے عنوان سے لکھتی ہیں:

"عرصہ سے میرا خیال تھا کہ میں اپنی بہنوں کی کوئی مذہبی خدمت انجام دوں، علیا حضرت کو بھی میرا یہ ارادہ معلوم تھا، اس بنا پر حضور ممدوحہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ بدء الاسلام کا ترجمہ فارسی عطا فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں اس کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرادوں، چنانچہ میں نے ترجمہ شروع کر دیا اور الحمدللہ کہ اب وہ شائع ہو رہا ہے۔

اس مختصر رسالہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کے سلسلہ وار حالات نہایت اختصار کے ساتھ درج ہیں، جن سے عام مسلمان بچوں کو واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

میں اس کتاب کی ناظرات سے یہ بھی امید رکھتی ہوں کہ وہ مطالعہ کرتے وقت سرکار عالیہ، مولانا مرحوم اور مجھ کو ضرور دعائے خیر سے یاد کریں گی"۔

(آغاز اسلام ص ہ)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ علامہ شبلی کے شیدائیوں میں سے تھے۔ انھوں نے "شبلی کا ذہنی ارتقا" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی تھی، ان کے ادبی وتنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "ادبی آئینے" جون ۱۹۷۴ء میں مکتبہ شاہد کراچی سے شائع ہوا ہے، اس میں علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن پر کئی مقالات شامل ہیں۔ اس کا دیباچہ ماہر تعلیم، ماہر لسانیات اور ۸۰/ سے زیادہ علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (۱۹۱۲ء-۲۰۰۵ء) نے لکھا ہے۔ وہ سید سخی احمد ہاشمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی ان کا خاص موضوع ہے اور ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ مولانا شبلی کا ذہنی ارتقا اپنی جامعیت کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ شاید ایک عرصے تک اس پر اضافہ نہ ہو سکے۔ خدا کرے کہ وہ مقالہ بھی جلد شائع ہو جائے اور علمی دنیا کو اس سے استفادے کا موقع ملے"۔ (ادبی آئینے ص د)

ادبی آئینے میں علامہ شبلی سے متعلق درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ حیات شبلی
۲۔ شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ
۳۔ شبلی کی قومی شاعری
۴۔ مولانا شبلی اور ترکی
۵۔ شبلی ایک انگریز مخالف
۶۔ مولانا شبلی کا مجوزہ دارالعلوم

ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ شبلی کا ذہنی ارتقاء کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر سید رفیق حسین

ڈاکٹر سید رفیق حسین (۱۹۱۳ء-۱۹۹۰ء) شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے صدر تھے۔ ان کا ذکر اردو کے ادیب، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ عظمت مراثی، پہلی تنقید پہلا نقاد، اردو غزل کی نشو ونما (۱۹۴۲ء) میر حسن کی حیات اور سحر البیان کا تنقیدی جائزہ (۱۹۶۰ء) گلزار عقیدت (۱۹۶۶ء) افسانوی اصول اور فسانہ عجائب (۱۹۷۵ء) مثنوی سحر البیان قصہ بے نظیر و بدر منیر (۱۹۷۸ء) گلزار نسیم مع تشریح و مقدمہ، ان کی کتابوں کے نام ہیں۔

۱۹۸۷ء میں انھوں نے ارن کمار اگروال پبلشر الہ آباد کی فرمائش پر موازنہ انیس و دبیر ایڈٹ کیا۔ ایک مقدمہ اور دو ضمیمے ان کے قلم سے ہیں، پہلا ضمیمہ مرثیہ فردوسی مشمولہ موازنہ اور دوسرا مرثیہ محتشم کاشی کے ترجمے ہیں۔ انھوں نے شبلی اور موازنہ کی تحسین و ستائش بھی کی ہے اور بعض تنقیدیں بھی، مگر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> ''مولانا شبلی کی فروگذاشتوں کا جو ذکر میں نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے یا کہنے نہ کہنے کی باتوں میں جو تنقیدی نکات آگئے ہیں، ان سے میری مراد مولانائے محترم کی منقصت نہیں ہے اور نہ ان پر طنز کرنا ہی مقصود ہے بلکہ تصنیف کو بہتر بنانا ہے''۔

ڈاکٹر رفیق حسین نے موازنہ کا تعارف اور اس کی اہمیت کا ذکر کیا ہے، البتہ تحسین و ستائش کے ساتھ متعدد کمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کمیوں کا معاملہ ذوقی ہے، مثلاً شبلی نے اتنی مثالیں دی ہیں کہ قاری اسی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ میر انیس کی جتنی تعریف کی گئی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے۔ انیس کے خیالات عالیہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ مرزا دبیر کے جتنے نقائص بیان کئے گئے ہیں وہ اس کے مستحق نہ تھے۔ شبلی نے حسینی مراثی کا ذکر نہیں کیا۔ مرثیہ گوئی کی صحیح تاریخ نہیں پیش کی گئی۔ اس طرح کے ان کے کچھ اور بھی اعتراضات ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کے باوجود موازنہ انیس و دبیر مولانا شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے جو سیکڑوں سال تک زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر سید رفیق حسین نے علامہ شبلی کی بعض خوبیوں اور ان کی بعض تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ شبلی کی سب سے بڑی خوبی ان کا آرگنائزر ہونا بتاتے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی۔ وہ بہت بڑے آرگنائزر تھے، جن اداروں کی تاسیس انھوں نے فرمائی وہ ان کے انتقال کے ستر سال بعد بھی ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ قیام حیدر آباد کے دوران انھوں نے کل ہند انجمن ترقی اردو کے بنیادی معتمد کے گراں قدر عہدہ کا بار اپنے کاندھوں پر رکھا اور کافی دنوں تک اس کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں رہے، لکھنؤ کے زمانہ قیام میں انھوں نے ندوۃ العلمائے ہند کی بنیاد رکھی۔ یہ بہت بڑا ادارہ ہو گیا، بر وقت انتقال اپنا ذاتی کتب خانہ اس ادارے کو مفت بخش

گئے، تیسرا بڑا ادارہ دارالمصنفین اپنے وطن اعظم گڑھ میں قائم کیا، جو اب شبلی اکیڈمی کے نام سے موسوم ہے، اسی کی ایک شاخ شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج ہے جہاں ہزاروں طلبہ اور طالبات تحصیل علم وادب میں مصروف ہیں، یہ اتنا بڑا کالج ہے کہ اسے یونیورسٹی کا درجہ ملنا چاہئے، اداروں کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھنے کے سلسلہ میں شبلی اپنے تمام معاصرین سے پیش پیش رہے"۔ (موازنہ انیس ودبیر مقدمہ ص ز)

علامہ شبلی کی ہمہ جہتی اور کثیر الجہات شخصیت پر وہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

"محل استعجاب ہے کہ اتنا کثیر المشاغل انسان کیسے اتنا کثیر التصانیف ہوگیا اور پھر یہ بھی کہ مولانا شبلی نے عمر بھی بہت طویل نہ پائی، وہ بیک وقت ادیب وشاعر، مورخ ونقاد، سیرت وسوانح نگار تھے"۔

ڈاکٹر سید رفیق حسین نے شعرالعجم کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

"شعرالعجم چار جلدوں میں پروفیسر براؤن کی تاریخ فارسی ادب سے پہلے شائع ہوگئی تھی۔ پروفیسر براؤن ایران میں کافی دنوں مقیم رہے اور شبلی نے ایران کی سرزمین پر قدم بھی نہ رکھا، شعرالعجم میں مولانا نے ایسے پھول کھلائے ہیں کہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں تحریر فرمایا ہے کہ شعرالعجم ایسی گراں بہا تصنیف کو پہلے دیکھ لیتے تو شاید وہ اپنی گراں بہا تصنیف نہ تحریر فرماتے۔ یہ الگ بات ہے کہ محمود شیرانی نے اپنا زور قلم دکھانے کے لئے اس پر چار ضخیم جلدوں میں تنقید شعرالعجم لکھی جسے اب کوئی جانتا بھی نہیں اور شعرالعجم آج بھی ویسی ہی تازہ اور شگفتہ ہے جیسے پہلے تھی"۔ (ایضاً)

تنقید شعرالعجم کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو کم از کم ڈاکٹر رفیق حسین تو نہ جانتے تھے ورنہ وہ اسے چار ضخیم جلدوں پر مشتمل قرار نہ دیتے۔ بہرحال انھوں نے موازنہ کا مفصل جائزہ لیا ہے، خوبیاں اور کمیاں دکھائی ہیں اور آخر میں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ "یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور سب تصانیف سے زیادہ مقبول ومطبوع ہے"۔

ڈاکٹر مسعود جعفر۔ حیدرآباد

بابری مسجد کے آنسو

کبھی تو لوٹ کے آئے گی بابری مسجد
کبھی تو ان میں نمازوں کے پھول برسیں گے
کبھی تو ہاتھ اٹھیں گے رخ فلک کی طرف
انہیں کو دیکھ کے موسم خزاں کے ترسیں گے

عجیب فیصلہ آیا ہے عدلیہ سے ابھی
وکیل عدل پہ حیرت زدہ ہیں ہائے سبھی
ملے گی ایک نہ اک دن یہ بابری مسجد
ہمارا غول بھی ہندوستاں میں ہوگا کبھی

اس المیہ کو پلٹ کر نہ دیکھنے والے
چبھے ہیں میرے کلیجہ میں زخم کے بھالے
عدالتوں کا سہارا بھی لے لیا تونے
مری زبان پہ تونے ہی کس دئے تالے

مولانا صدرالدین اصلاحی

ایمان بالآخرت

یہ بات کہ ایک جزاء آنے والا ہے، قرآن میں جس اہتمام سے بیان ہوئی ہے، اس کو دیکھ کر عام ذہن تو یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ بھی ایمان باللہ کی طرح اپنی ایک مستقل اصل اور حیثیت رکھتی ہے، مگر فی الواقع یہ اسی ایمان باللہ کی ایک فرع ہے، یا یوں کہئے کہ اس کا ایک قریب ترین مقتضا ہے، اس لیے کہ ایمان باللہ کے معنی ہیں ذات الٰہی اور صفات باری تعالیٰ کا ٹھیک ٹھیک تصور اور اذعان۔ ان صفات میں جو صفتیں نمایاں ترین ہیں اور جن کے جلوے ہر سمت چھائے نظر آتے ہیں، ان میں عدل، حکمت اور رحمت کی صفات بھی ہیں۔ یہ تینوں صفات چاہتی ہیں اور اپنا پہلا مطالبہ یہی پیش کرتی ہیں کہ ایک نہ ایک دن جزاء وسزا کی میزان آویزاں کی جائے، ورنہ یہ صفات ناقص اور کمال سے عاری صفات ذاتِ الٰہی سے اس وقت تک منسوب نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ وجوب وامکان کے معنی ایک نہ سمجھ لیے جائیں اور خالق کو مخلوقات کی صفت میں نہ لا کھڑا کیا جائے۔ آیئے یہ دیکھیں کہ یہ صفتیں ایک یوم جزاء کے آنے کو کیونکر مستلزم اور اس کی متقاضی ہیں۔ ویسے تو ایک مستقل بحث ہے جو غور وفکر کی ایک طولانی تفصیل چاہتی ہے، لیکن اس تفصیل کا موقع یہ نہیں، اس لیے یہاں صرف چند سرسری اشارات پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

عدل کے معنی ہیں کانٹے کی تول، حق رسانی، یعنی جو شخص جس حق اور جس انجام کا مستحق ہو وہ ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے رکھ دیا جائے، پس اگر اللہ تعالیٰ عادل ہے تو اس کا مجرد عادل ہونا ہی تقاضہ کرتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے۔ اس نے جو اخلاقی حدود مقرر کئے ہیں، ان کی پابندی کرنے والے کو اپنی خوشنودیوں اور نعمتوں سے شاد کام کرے اور جس نے ان حدود کا پاس نہ کیا ہو، اس کو قرار واقعی سزا دے۔ عدل وانصاف کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے آج تک اختلاف ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ دنیا میں کسی نے بھی دوست اور دشمن، فرمانبردار اور نافرمان، اطاعت کیش اور باغی دونوں کو ایک برتاؤ کا اہل نہیں سمجھا، تو یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ذات جو سراپا عدل وانصاف ہے، وہ اپنے وفادار اور باغیوں میں تمیز نہ کرے گی۔ چنانچہ اس نے خود ان لوگوں سے جو اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنے اعمال بد کے انجام سے بے فکر تھے۔ حیرت کے انداز میں اور زجر وتوبیخ کے ساتھ پوچھا اور بار بار پوچھا کہ نادانو! جب یہ ایک حقیقت ہے کہ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ، وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ، وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ، وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ (فاطر) ''اور اندھا اور آنکھوں والا (دونوں) برابر نہیں، اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا، اور نہ سایہ اور نہ دھوپ، اور نہ زندہ اور نہ مردہ برابر نہیں ہوسکتے'' اور تم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے، تو پھر تمہارے دماغ میں بقائمی ہوش وحواس اتنی بڑی غیر معقول بات کیوں کر سما جاتی ہے کہ ہم مسلم اور مجرم دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ، مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (القلم) ''کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانیوں کے برابر کردیں گے، تم کو کیا ہوا، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو''

غرض نیکوکاروں کو اچھا اور بدکاروں کو برا بدلہ ملنا اور

ان کے اعمال کے عین مطابق ملنا عدل باری تعالیٰ کا سب سے پہلا اور لازمی تقاضہ ہے، مگر اس دنیا میں عملاً ہو کیا رہا ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ یہاں کی خوش حالیاں، یہاں کی زینتیں، یہاں کی سربلندیاں بالعموم ان کو نہیں ملتیں جو اہل حق ہیں، بلکہ الٹی ان کے حصہ میں آتی ہیں جو حق کے دشمن اور احکام الٰہی کی دھجیاں اڑانے والے ہیں؟ اسی طرح کیا وہ جو ان احکام کی پیروی کرتے ہیں، ان کے گردوپیش بدحالیاں، گمنامیاں، فلاکتیں؟ مظلومتیں نہیں چھائی رہتی ہیں؟ کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ بدی (ظلم) کیا دی (مکاری) اور بے ایمانی کی راہ دولت وعزت کے عشرت کدوں میں لے جاتی ہیں اور نیکی روی، حسن خلق، حق شناسی اور اللہ پرستی کا راستہ ان خارزاروں میں پہنچا دیا کرتا ہے، جہاں مصیبتوں کے کانٹے انسان کے جسم وجان چھلنی بنا دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے اور ہماری آنکھیں اسی حقیقت کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں، تو اگر کوئی دوسرا عالم نہ برپا ہوا اور کوئی ایسا دن نہ آئے جس میں اس صورتحال کو پلٹ دیا جائے اور ہر شخص کا حساب اس کے اعمال کے صحیح استحقاق کے مطابق چکا دیا جائے تو اللہ کا وہ عدل کہاں گیا جو اس کی بدیہی صفات کمال میں سے ہے! اس لیے اگر اللہ عادل ہے تو ایک یوم الحساب کا آنا اس کے عدل کا ویسا ہی لازمہ ہے، جیسا کہ عدل اس کی شانِ فرمانروائی کا۔

اب صفتِ حکمت کو لیجئے۔ حکیم کہتے ہی اس کو ہیں جس کا کوئی فعل مفید اور مقصدیت سے خالی نہ ہو، جو جتنا بڑا حکیم ہوگا، اس کے افعال اتنے ہی زیادہ بامقصد اور پر ازحکمت ہوں گے۔ یہ ایک عام مسلمہ ہے اور علم ومنطق کے ابتدائی بدیہیات میں سے ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں اس حکیم ودانائے مطلق کے افعال وشئون پر نگاہ ڈالئے جو سراپا حکمت اور منبع حکمت ہے۔ یہ کارگاہ عالم، جو آپ کی نگاہوں کے سامنے اور آپ کی حدود نظر میں ہے، اسی حکیم کے کارناموں کا ایک باب ہے۔ اس پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہ عظیم الشان کائنات، جس کے تمام اجزاء منظم طور پر سعی وحرکت میں لگے ہوئے ہیں، جس کے مختلف حصوں اور متضاد عناصر میں کامل توافق وہم آہنگی نظر آرہی ہے، جس کا ایک ایک ورق علت ومعلول کے ناقابل شکست شیرازہ میں بندھا ہوا ہے۔ کیا یہ کائنات اپنی تخلیق کے پیچھے کوئی غایت نہیں رکھتی؟ جس کائنات کا ہر جز واپنی جگہ نہایت کھلے ہوئے مقاصد کا حامل ہے، کیا وہ بحیثیت مجموعی اپنا کوئی مقصد نہیں رکھتی؟ یعنی کل کا جز وتو بجائے خود بامقصد ہو، مگر کل بحیثیت کل بے مقصد ہو! عقلِ سلیم اسے کیسے مان سکتی ہے؟ اور پھر یہ انسان جس کو عقل وفکر کی بے نظیر صلاحیتیں اور سعی وعمل کی حدود ناآشنا قابلیتیں دے کر بھیجا گیا ہے، کیا اس کی آفرینش مقصدیت سے تہی دامن ہوسکتی ہے؟ جس انسان کی چاکری میں زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے آفتاب وماہتاب تک لگے ہوئے ہوں، وہ خود کسی غایت ومقصد کی غلامی سے آزاد ہے؟ خالق کائنات کو حکیم ماننے والا اس سوال کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ اس کی بصیرت کی نگاہیں تو جب ان حقائق کو دیکھیں گی تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھے گا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً، سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران) ''اللہ تو نے یہ (عظیم الشان کارخانہ) عبث نہیں بنایا ہے تو اس سے برتر ہے کہ کوئی کار عبث کرے، پس (یقیناً ہمارا وجود ایک بامقصد اور ذمہ دار وجود ہے، لہٰذا مقصد فراموشی اور غیر ذمہ داری کے وبال یعنی) عذاب جہنم سے ہمیں بچا'' اور وہ جب بھی اللہ کی صفت حکمت کا تصور کرے گا، اس کی زبان اللہ کی آیات پڑھ کر باندازِ استعجاب دنیا سے سوال کرے گی کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامہ) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟

مفتی امانت علی قاسمی استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

مسلم بچوں کے تعلیمی مسائل اور مدارس کی موجودہ صورت حال

تعلیم انسانی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، تعلیم انسانی زیور ہے جس سے انسان کے نہ صرف حسن میں نکھار پیدا ہوتا ہے؛ بلکہ اس سے اس کے باطن اور روح میں بھی تازگی آتی ہے، یہ وہ کنجی ہے جس سے علم و معرفت اور عقل وفکر کے دریچے کھلتے ہیں ا، انسان، حیوان سے ممتاز ہوتا ہے، صحیح اور غلط کی تمیز، فکر وشعور کی بلندی، نظر وفکر کی پختگی کی بنیاد تعلیم ہے، تعلیم وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ انسان باطل کو کچل دیتا ہے، یہ وہ خوشبو ہے جس سے پورا معاشرہ معطر ہو جاتا ہے، یہ وہ روشنی ہے جس سے ہر گھر، آنگن منور ہو جاتے ہیں تعلیم اس سورج کے مانند ہے جس سے لوگ توانائی حاصل کرتے ہیں تعلیم ایک سمت کا نام ہے جس پر چل کر انسان منزل کو پاتا ہے، تعلیم اس خواب کا نام ہے جس کی حقیقی تعبیر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے؛ تعلیم وہ کسوٹی ہے جس پر معاشرے کی بلندی کے معیار کو پرکھا جاتا ہے؛ اسی لیے قرآن کریم تعلیم والے اور غیر تعلیم والے کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے بیان کرتا ہے **هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون .**

اس وقت تعلیم پر کافی توجہ دی جارہی ہے اور تعلیم کا شعور لوگوں میں بیدار ہوا ہے، لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ تعلیم کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، کسان ہوں یا مزدور، رکشہ چلانے والا ہو یا اپاہج، پڑھا لکھا ہو یا انپڑھ، طاقت ور باپ ہو یا بے سہارا ماں، ہر کوئی تعلیم کی عظمت اور قوت سے واقف ہے، اس کی اہمیت و افادیت سے روشناس ہے، آج ہر کوئی اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتا ہے۔ تعلیمی ادارے بڑی تیزی سے کھل رہے ہیں، سرکار بھی تعلیم پر توجہ دے رہی؛ لیکن اس وقت مسلم بچوں کی تعلیم کے بہت سے پیچیدہ مسائل سامنے آرہے ہیں، اور دیندار مسلمانوں میں اپنے بچوں کی تعلیم کی بڑی فکر پائی جاتی ہے، اس لیے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں میں دو نظریۂ تعلیم اور دو نظام تعلیم نے مسلمانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، مدارس کی تعلیم، جہاں صرف مذہبی تعلیم اور قرآن وحدیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور عصری درسگاہوں کی تعلیم، اسکول وکالج کی تعلیم، جہاں صرف عصری مضامین پڑھائے جاتے ہیں اگر چہ دونوں جگہ جزوی تبدیلی سے انکار نہیں ہے لیکن عمومی صورت حال یہی ہے۔

ایک دیندار مسلمان اپنے بچوں کو اسکول میں نہیں بھیجنا چاہتا ہے کہ اس سے وہ دہریہ بن جائے گا، مذہب بیزار ہو جائے گا، دین واسلام سے دور ہو جائے گا، مذہب اور قرآن وحدیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہ جائے گا، اسلام کے تعلق سے اس کے اندر شکوک وشبہات جنم لینے لگیں گے، اسلامی تہذیب اور اسلامی اقدار اس سے مفقود ہو جائیں گے، آج کل اسکولوں میں زیادہ تر ایسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس طرح کے کلچرل پروگرام کرائے جاتے ہیں اور اس انداز پر ذہن سازی کی جاتی ہے کہ دین دار انسان کے لیے قابل تشویش ہے ۔ دوسری طرف وہ دیندار انسان اپنے بچوں کو مدارس میں بھی داخل نہیں کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ اس مدارس کے فضلاء کی حیثیت عرفی متاثر ہے، ان کے پاس کے ذرائع آمدنی اور اپنی

خدمات کے لیے وسیع میدان میں مسجد اور مدرسہ آتے ہیں جہاں تنخواہ کی قلت ہے اور معاشرے میں امام کی ناقدری جگ ظاہر ہے؛ اس لیے وہ انسان جو اپنی آنکھوں سے امام اور فضلاء مدارس کے ساتھ اس طرح کا ذلت آمیز سلوک دیکھتا ہے وہ قطعا اپنے بچوں کو مدارس میں بھیجنے کا روادار نہیں ہوتا ہے، پھر فضلاء مدارس کی جو کھیپ اس وقت تیار ہو رہی ہے ان کے لیے مدارس اور مساجد کی دنیا میں بھی مواقع نہیں ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فراغت کے وقت ان کے سامنے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں اور زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار کر اور تعلیم کے میدان میں دس سالہ وقفہ کے بعد اب انہیں فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے، اس وقت بعض طلبہ عصری درسگاہوں کا رخ کرتے ہیں جب کہ بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے ان کے لیے وہاں بھی کامیابی کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان جہاں ہم رہتے ہیں، جو ہمارا ملک ہے، اور جہاں ہم صدیوں سے آباد ہیں، ہم اس ملک میں اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتے ہیں جب تک ہم انتظامیہ میں مؤثر نہ ہوں ،اور انتظامیہ میں مؤثر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس تعلیم کا حصہ بنیں جس کے ذریعہ ہم وہاں پر مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں بعض مسلمان یقیناً یہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس مقام تک پہنچتے ہیں لیکن اسلام کے مطلوبہ معیار میں کمی اور دینی تعلیم سے دوری کی وجہ سے، ایسے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت نہیں ہوتے اس لیے کہ جو خود اسلام کے حقیقی روح سے ناواقف ہو اور اسلام کی صحیح تصویر اس کے سامنے نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ان سے اس طرح کی توقع بھی نہیں ہونی چاہیے، اس کے بالمقابل بعض غیر مسلم تنظیموں میں نے اپنے مخصوص ادارے قائم کئے جہاں انہوں نے اپنے مذہب کی تعلیم دی اور اس کی آڑ میں انہوں نے اپنی قوم کے تئیں ایک خاص جذبہ لوگوں میں بیدار کیا اس کے لیے ان کو جس طرح کی ضرورت تھی انہوں نے کیا؛ لیکن ساتھ میں انہوں نے عصری تعلیم سے بھی آراستہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ایک آدمی چیف جسٹس کی کرسی پر بیٹھ کر بھی اپنی قوم اور اپنے فلسفہ کی فکر کرتا ہے جب کہ ہم اس میدان میں دور تک نہیں ہیں، ہمارے جو مسائل ہیں ان کے حل لیے نہ کوئی ادارہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی شخصیت جو اس سلسلے میں مؤثر رہنمائی کر سکے۔ اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

بعض ناگزیر حالات کی بنا پر ہمارے اکابر نے اسلام اور قرآن کی حفاظت کے لیے یہ فیصلہ لیا تھا کہ ایسے مدارس قائم کئے جائیں جہاں مسلم بچوں کے ایمان کی حفاظت ہو اور اسلام کی ،اسلامی تہذیب کی حفاظت ہو اور اس وقت کے حالات ایسے نہیں تھے کہ مسلمان انتظامیہ کا حصہ بنیں اس لیے کہ انگریز کی ملازمت ہی حرام تھی تو ان کے ساتھ حکومت میں کام کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا لیکن ملک آزاد ہوا اور آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کے وہ عارضی نظام تعلیم جس میں صرف قرآن و حدیث کو اور اسلامی تعلیمات کو ہی جگہ دی گئی تھی لازمی قرار دے دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دو گروہ میں تقسیم ہو گئے ایک طبقہ مدارس میں اپنے بچوں کو پڑھانے کے اپنے لیے فخر تصور کرنے لگا؛ جب کہ دوسرے طبقہ نے عصری درسگاہوں میں تعلیم دلانے کو ضروری تصور کیا۔ اس طرح ایک طرف سچے پکے دیندار تیار ہوئے لیکن وہ اپنے ایمان اور قوم کے ایمان کی فکر تو کر سکتے ہیں لیکن وہ قوم، سماج اور ملک کی خدمت کرنے سے قاصر تھے اس لیے کہ ان کے پاس وہ تعلیم نہیں ہے دوسری طرف ایک وہ طبقہ ہے جنہوں نے عصری تعلیم حاصل کر کے اونچی ڈگری حاصل کر لی، ملازمت میں آ گئے، لیکن وہ مطلوبہ دینی حمیت اور جذبہ سے خالی ہیں جس سے وہ اپنی قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں یہ بات عموم کے طور پر کہی جا رہی ہے اس سے استثنیٰ

ضرور ہے اور اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن اس صورت حال نے مسلمانوں کو بے چین کر دیا ہے اب ایک دیندار مسلمان اپنے بچوں کا بہتر مستقبل بھی چاہتا ہے اور اس کے دین و ایمان کی حفاظت کی ضمانت بھی ایسے دوراہے پر اسے کوئی ایسا ادارہ نظر نہیں آتا جہاں اس کے دین کی بھی فکر ہو اور ان کے دینا کی بھی ،ایک ایسی تعلیم جس کے ذریعہ ایک دھڑکنے والا دل تیار ہو جس میں خدا کا تصور بھی ہو اور ملک وملت کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ بھی ،ایک ایسا نظام تعلیم جو فکر آخرت پر مبنی ہو لیکن مطلوبہ دنیاوی ضرورت کی اس میں رعایت بھی ہو، یہ اس وقت ایک بنیادی ضرورت بن چکی ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

اس وقت مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کے ہزار خوبی کے اعتراف کے ساتھ ہمیں یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اچھائی کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی ہے، اس وقت ہم جو تعلیم دیتے ہیں، اس کا ایک دشوار گزار پہلو یہ ہے کہ اس تعلیم کے بعد اگر چہ ہمارے فضلاء کے اندر بہت سی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن ہمارے فضلاء قومی دھارے میں شامل نہیں ہو پاتے ہیں، انہیں جو پاسپورٹ بنانا پڑتا ہے اور ان پڑھ اور ناخواندہ کا پاسپورٹ بنانا پڑتا ہے، اس وقت ہمارے فضلاء بھی سیاست میں حصہ لیتے ہیں جو ایک اچھا اور مستحسن قدم ہے اس کے ذریعہ ہم اپنے آپ کو مضبوط کر سکتے ہیں، قوم کے سیاسی حقوق کی بازیابی کے لیے جد جہد کے کر سکتے ہیں، جمہوری ملک جس کی بنیاد چار ستونوں پر ہوتی ہے، انتظامیہ، عدلیہ، میڈیا اور مقننہ، جب تک ان چاروں میں اپنی صحیح نمائندگی درج نہیں کراتے ہیں اس وقت تک ہم جمہوریت کو مضبوط قائم و باقی نہیں رکھ سکتے ہیں، ابھی چند دن قبل کیرلا سے یہ خبر آئی کہ تین فضلاء مدارس نے وکالت کا امتحان پاس کر کے بحیثیت وکیل اپنا نام درج کرایا، اس کی پذیرائی کی گئی لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے انفرادی واقعات انفرادی صلاحیت کی بناء پر ہوتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے نظام تعلیم کو اس انداز پر مرتب کریں جس میں مدارس کی روح اور اس کی بنیاد کی پوری رعایت کی گئی ہو اور ساتھ میں عصری علوم کو بھی شامل کیا گیا ہو تو ہمارے یہ فضلاء قومی دھارے میں شامل ہو کر پہلے سے کہیں زیادہ خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کل بھی مدارس نے مسلمانوں کی قیادت کی ہے، اور آج بھی مدارس میں قیادت کی اہلیت ہے اور دنیا کی نگاہیں اس پر ٹکی ہوئی ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ مدارس کے نظام تعلیم کا از سر نو جائزہ لیا جائے، مدارس میں آنے والے طلبہ میں نہ ٹیلنٹ کی کمی ہے اور نہ ہی محنت کی بس وسائل اور رہنمائی کی کمی ہے، اگر مدارس میں عصری علوم کی شمولیت کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ یہ طلبہ اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے ساتھ ملک وملت کے لیے بہتر فریضہ انجام دیں، آج یہ حقیقت ہے کہ مدارس میں طلبہ کا رجحان بہت کم ہو چکا ہے ،آئے دن مدراس میں بچے کم ہو رہے ہیں، بعض مدراس میں جہاں سو دو سو طلبہ پڑھتے تھے آج وہاں حفظ کی جماعت کا باقی رکھنا مشکل ہو گیا، ہر سال شوال میں کتنے ہی مدارس ہیں جو استاذہ کو یہ کہہ کر نکال دیتے ہیں کہ اس سال اس جماعت میں طلبہ نہیں ہے اس لیے آپ کی ضرورت نہیں ہے، یہ صورت حال ہر بصیرت رکھنے والا شخص محسوس کر سکتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے مدارس کا اصل سرمایہ، ملت کے دین و ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری ہے، اس کے ساتھ وسائل کی اس وسیع دنیا میں اگر مقاصد میں اضافہ کر دیا جائے اور اس کے مقاصد میں دین و ایمان کی حفاظت کے ساتھ اسلام کی اشاعت اور اسلام کو درپیش چیلنج کے جواب دہی کی صلاحیت پیدا کرنا بھی شامل کر دیا جائے اور اس کے مطلوبہ نظام و نصاب اور طریقہ تعلیم میں مزید نکھار پیدا کی جائے تو امید ہے کہ اس سمت

میں بھی ہمیں کامیابی ملے گی، اس وقت کی قومی زبان ہندی ہے اور بین الاقوامی زبان انگریزی ہے ہم ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہم برادران وطن میں اپنی بات مؤثر انداز پر نہیں کر پاتے ہیں، اسی طرح لبرل ازم کے اس دور میں جہاں اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے ہیں اور مذہب بیزاری کو جس پروپیگنڈہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اس نے ہمیں اپنے نظام تعلیم پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا ہے ضرورت ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں ان باتوں کو بھی ملحوظ رکھیں۔ اس تحریر کا مقصد مدارس کے نظام کو غیر مؤثر بتانا بالکل نہیں ہے، بلکہ مدارس نے ماضی میں بھی حیرت انگریز کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت بھی وہ اپنے مقاصد میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس تحریر کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مزید بہتر بنانے کے لیے اور اپنے فضلاء کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے وقت کے تقاضوں کے مطابق کیا تبدیلی کر سکتے ہیں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

دارالعلوم وقف دیوبند امت مسلمہ کا قیمتی سرمایہ ہے اور ایشاء میں تعلیمی مقام میں بلند حیثیت کا حامل ہے، جس کی موجودہ قیادت نوجوان، وسیع الظرف اور دوررس ہے، جس کی تعلیمی پالیسی میں فکر نانوتوی روح گنگوہی شامل ہے۔ دارالعلوم وقف نے ادھر چند سالوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ جگ ظاہر ہے۔ دارالعلوم وقف نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے نظام تعلیم میں جزوی تبدیلی کی ہے اور عربی کی پہلی کلاس میں عربی کے تمام مطلوبہ معیار کو سامنے رکھتے ہوئے عصری علوم کو شامل کیا ہے اس طرح ہر سال میں عصری علوم کے ضروری مضامین کو شامل کر کے طلبہ کو عصری معیار کے مطابق اسنادات سے ہم کنار کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ ایسا مستحسن قدم ہے جس کے انشاءاللہ بہتر نتائج سامنے آئیں

عطیہ پروین بلگرامی۔ اتر پردیش

غزل

اجالے آج بھی ان کے ہمارے پاس رہتے ہیں
اگر ایسا نہ ہو تو ہم بہت بے آس رہتے ہیں
دعائیں ہم ہمیں دو یا نہ دو لیکن یقیں کرلو
تمہاری خیر کے خاطر لگائے آس ہتے ہیں
خوشی اور شادمانی کی جگہ کیسے یہاں ہوگی
ہمارے دل میں رنج وفکر آس و پاس رہتے ہیں
بڑے اس خاندان میں اک الگ ہی شان تھی ان کی
نگینوں میں کہ جیسے منفرد الماس رہتے ہیں
نہ جانے کون ہم سے خوش ہو اور کون ناخوش ہے
ہمیشہ ہم کو گھیرے بس یہی احساس رہتے ہیں
جنہیں ماں باپ سے اپنے بزرگوں سے ہو بیزاری
جو سچ پوچھو تو ایسے لوگ بس پھر ناس رہتے ہیں
وہ دنیا کی نظر میں دور ہم سے ہوگئے لیکن
کسی کو کیا خبر نزدیک ہر اک سانس رہتے ہیں
ہمیں ہے چار میناروں کا پرویں شہر وہ پیارا
جہاں پیارے سے اک بھائی مرے الیاس رہتے ہیں

گے مدارس کی طرف سے طلبہ کی بے توجہی اور عدم رجحان پر بھی قدغن لگ سکتا ہے بلکہ طلبہ کا رجحان بڑھے گا۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ وقت کی ضرورت ہے جسے دوسرے مدارس کو اختیار کرنا چاہیے۔

آخری قسط

حکیم وسیم احمد اعظمی۔لکھنؤ

'شبلی خودنوشتوں میں'——ایک مطالعہ

مولانا محمد علی جوہر[۱۹۳۱ء—۱۸۷۸ء] نے علی گڑھ میں شبلی کے درس قرآن کے شاگردوں میں تھے، اسی لیے ان کی تحریروں میں شبلی کا ذکر استادِ مکرم، استاذی و مولائی، مولانا و استاذنا کے القاب سے ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شبلی اُن کے شیخ طریقت تھے اور خود شبلی اپنے اس شاگرد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے شبلی کے درس قرآن سے متاثر ہوکر کئی دانش گاہوں میں اس کا نفاذ کیا تھا، لیکن شبلی جیسا درس دینے والا اُنہیں نہیں ملا۔ مولانا محمد علی جوہر ہر دور میں شبلی اور ان کی فکریات کا حصہ رہے تھے۔ شبلی نے ان کی خواہش پر 'اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر' پر ایک نظر لکھی تھی۔ یہ بات دیگر ہے کہ شیخ محمد عبداللہ پاپامیاں کو شبلی کے اِس شعر میں 'ہندوکُش' لفظ پر اعتراض تھا:

تمہیں لے دے کہ ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہندوکُش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

مولانا محمد علی جوہر کی دلی آرزو تھی کہ وہ اس سیاسی ہماہمی سے نجات پائیں تو شبلی کی سیرت النبی کا انگریزی ترجمہ کرکے اپنے استاذ کی روح کو سرشار کریں اور اپنے لیے نجات اُخروی کی سبیل پیدا کریں، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ وہ یہ حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''مولانا کی آپ بیتی نامکمل رہی ورنہ خدا جانے وہ اپنے استاد کا کس کس طرح ذکر کرتے اور کیسے کیسے احوال بیان کرتے۔''

اس میں اُنہوں نے ایک خاص زاویہ نگاہ سے شبلی پر لکھا ہے اور نقد کے لیے جو معیار مقرر کیا ہے اور جو زبان استعمال کی ہے وہ خود ان کے متعین کردہ معیارِ نقد سے مزاحم ہے، پھر تو ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے لیے بعد کی راہ از خود آسان ہوجاتی ہے اور وہ سر ضامن علی کو آئینہ دکھادیتے ہیں اور کام تمام ہوجاتا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد[۱۹۵۸ء — ۱۸۸۸ء] کا 'تذکرہ' بھی جہات شبلی کی تفہیم میں بڑا معاون ہے۔ یہ اُن کی خونوشت کا پہلا حصہ ہے۔ مولانا آزاد کی دینی و فکری تربیت میں شبلی کا بڑا حصہ ہے۔ وہ شبلی کے تعلق میں ۱۹۰۴ء میں آئے تو ان کی عمر محض چودہ سال تھی اور شبلی کی وفات ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء تک ان کے ربط و تعلق میں رہے تھے۔ شبلی نے اُن کی صلاحیتوں کو اُبھارنے کی حتی المقدور کوششیں کیں۔ اپنے زمانہ قیام حیدر آباد میں اُنہیں وہاں آنے کی دعوت دی۔ جب وہ حیدر آباد سے مستعفی ہوکر لکھنؤ آئے تو اُنہیں لکھنؤ بلالیا اور الندوہ کی ادارت میں شریک کیا۔ اس کے بعد وہ جہاں بھی رہے شبلی کے رابطہ میں رہے۔ بعد میں جب وہ سلفیت کے زیر اثر آئے تو شبلی کی کچھ کتابوں پر نقد بھی کیا، لیکن جب معاملہ خالصتاً علمی اور نظریاتی ہو تو اس کا اثر ذاتی تعلقات پر نہیں پڑتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی اس طرح کی تحریروں کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ربط و تعلق کے مطالعے کی کئی جہات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ملا واحدی[۱۹۷۶ء—۱۸۸۸ء] کے 'میرا افسانہ' میں شبلی کے بیانیہ کا کڑوا سچ یہ ہے کہ اس میں ملا واحدی نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر اپنی بلند قامتی کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ وہ شبلی کے قیام دہلی ۱۹۰۸ء میں خواجہ حسن نظامی کی جانب سے اقامتی سہولتیں پہنچانے کے لیے پابند کیے گئے تھے۔ لیکن اُنہوں نے شبلی کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں کہ گویا وہ ان کے حاضر باشوں میں رہے ہوں۔ اُنہوں نے رشید رضا مصری (وفات ۱۹۳۵ء) کی لکھنؤ آمد کو دہلی سے منسوب کردیا ہے اور ایک خلافِ واقعہ بات بھی لکھی اور اس تیقن کے ساتھ لکھی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اُنہیں اِس سے سروکار نہیں کہ اُن کے اس عمل سے ایک بہت

بڑے دانشور کی کردار کشی ہورہی ہے۔ اُنہوں نے مولانا محمد فاروق چیریا کوٹی کو رشید رضا مصری کے مترجم کے طور پر پیش کردیا ہے اور اس کے بعد خوب بے پر کی اُڑائی ہے۔ پہلی ان کی تحریر ملاحظہ کریں:

''علامہ رشید رضا نے خطبہ لکھا نہیں تھا، علامہ برجستہ بولتے تھے۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی (استاد مولانا شبلی) کے ذمہ تھا کہ ترجمہ کریں گے، مگر ترجمہ کرنے لگے تو متبحر عالم ہونے کے باوجود سٹ پٹا گئے، مولانا شبلی نے فوراً مولانا ابوالکلام کو اشارہ کیا۔ مولانا اگلی صف سے اُٹھے اور اسٹیج پر پہنچے اور حاضرین سے کہا کہ الگ الگ فقروں کا ترجمہ نہیں کروں گا۔ صاحبِ صدر کی تقریر ختم ہونے دیجئے، پوری تقریر کا ترجمہ ایک ساتھ کردوں گا۔ چنانچہ تیئیس سالہ ابو الکلام نے ایسا مربوط ترجمہ سنایا کہ بوڑھے اور متبحر علماء کو متحیر کردیا''۔

[میرا افسانہ بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۱۵۰]

یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''ملا واحدی کے اس اقتباس سے جہاں مولانا آزاد کی عربی دانی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں پہلی بار یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ رشید رضا کی تقریر کے ترجمہ کی ذمہ داری مولانا فاروق چریا کوٹی کے ذمہ تھی''۔ [شبلی خودنوشتوں میں، ص ۱۵۰]

لیکن ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اپنی متذکرہ بالا تحریر پر خود حیرت زدہ ہیں کہ اُنہوں نے تاریخی تناظر میں ملا واحدی پر بروقت نقد کیوں نہیں کیا؟ اُنہوں نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ علامہ محمد فاروق چریا کوٹی کی وفات تو ۱۹۰۹ء میں ہوگئی تھی اور علامہ رشید رضا کی تقریر کے ترجمے کا واقعہ ۱۹۱۲ء ہے، اور وہ بروقت نقد واحتساب نہ کرسکنے پر متأسف بھی تھے۔ میں نے یہ بیان کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ قاری پر واضح ہوجائے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی نظر اس خلافِ واقعہ بات پر پڑ گئی تھی، — دراصل ملا واحدی نے اس واقعہ کو جملہ جزئیات کے ساتھ اس قدر طلاقت لسانی اور سلاست وروانی سے بیان کیا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے قاری ان کے بیانیہ کی سحر طرازی میں کھو سا جاتا ہے اور وہ اس جلسہ کا حصّہ بن کر تیئیس سالہ ابوالکلام کو حاضرین کی اگلی صف سے اُٹھتے، اسٹیج پر پہنچتے اور حاضرین سے رشید رضا مصری کے خطاب کے بعد پوری تقریر کا ترجمہ کرتے اور ترجمہ کے بعد بوڑھے اور متبحر علماء کو متحیر ہوتے ہوئے چشمِ تصور سے دیکھنے لگتا ہے۔ ملا واحدی کے اس خلاف واقعہ بیانیہ سے شبلی کے بارے میں ان کی بہت سی باتوں پر یقین کرنے میں تردد ہونے لگتا ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی [۱۹۷۶ء — ۱۸۸۹ء] کی 'سر گذشت' میں بھی 'ذکرِ شبلی' ہے۔ وہ شبلی کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ شبلی نے ان کی تربیت پر بطور خاص توجہ دی تھی۔ اُنہوں نے اس سرگذشت میں کچھ ایسے حقائق بیان کیے ہیں، جن سے شبلی کی شخصیت اور بھی محترم اور مکرم ہوجاتی ہے۔ وہ شبلی سے پہلے کے ندوہ اور شبلی کے وقت کے ندوہ کا تقابل بڑی جرأت اور بے باکی سے کرتے ہیں، جس کے بعد بہت سی لائق احترام شخصیتوں کی منصوبہ بند 'کذب بیانی' اپنے گھناؤنے روپ میں سامنے آجاتی ہے۔ کہاں یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ شبلی کے دور میں ندوہ کا علمی اور روحانی ماحول خراب ہوا تھا اور مولانا عبدالباری ندوی جو شبلی کے ندوہ آنے کے پہلے سے زیرِ تعلیم تھے، وہ دونوں دور کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عہدِ شبلی کا اثر: عام طور پر ندوہ کے طلبہ پر یہ پڑا کہ ان میں نہ صرف درسی کتابوں کے پڑھنے کا شوق بڑھ گیا بلکہ غیر درسی کتابوں کے پڑھنے کا بھی عام شوق ہوگیا، ساتھ ہی مضمون نگاری کا بھی۔ کتب خانہ جس میں پہلے شاذ و نادر ہی دو ایک طالب علم نظر آتے تھے، اب قریب قریب بھرا رہتا، نیز مولانا کے اثر سے تاریخ و ادب کے مطالعہ، تقریر و تحریر کا شوق و ذوق عام ہوگیا تھا'' [سر گذشت بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۱۵۵]

شبلی کے بارے میں 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' کے بعض مندرجات اور اس میں شبلی کی خدمات کو نظر انداز کیے جانے سے بھی مولانا عبدالباری ندوی رنجور تھے اور اس کتاب کے مصنف سید محمد الحسنی [۱۹۷۹ء۔۱۹۳۵ء] کو بھی عہدِ شبلی کے ندوہ کی دین خیال کرتے تھے، لکھتے ہیں:

''آہ کیسی دولت کھوئی ندوہ نے اپنے ہاتھ سے۔ بہر حال ندوہ جو آج عرب وعجم میں شہرت رکھتا ہے خصوصاً مولانا علی میاں سلمہم اور میرے مخدوم بزرگ اور علی میاں کے برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی

صاحب مرحوم کے صاحبزادے محمد میاں سلمہم جوالبعث وغیرہ نکالتے ہیں، اس کو عاجز دیانۂ عہدِ شبلی کی دین جانتا ہے، کیونکہ ان سب کی بنیاد پڑی شبلی ہی کے دور میں تھی۔'' [سرگذشت بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۱۶۵]

علی میاں نے 'پرانے چراغ' حصۂ دوم میں مولانا عبد الباری ندوی کی ان جرأت مندانہ تحریروں کو ملازمت سے سبکدوشی اور خانہ نشینی کے آخری ایام کی تحریریں قرار دے کر شعوری طور پر اس کی اثر پذیری کو کم کرنے لفظ 'اور ایام' کے ذریعہ ایک بوڑھے کی بڑ قرار دینے کی سعی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سبک دوشی اور خانہ نشینی کے آخری ایام میں مولانا شبلی کی یاد بھی ان کو بہت آنے لگی تھی۔ ان کے احسانات، ان کی تعلیم و تربیت کے گہرے اثرات کا وہ اپنی تحریر و تقریر میں بار بار تذکرہ فرماتے اور موجودہ دار العلوم کو وہ بانی ندوۃ العلما مولانا محمد علی مونگیری کے بجائے مولانا شبلی کا ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے''۔ [پرانے چراغ، حصۂ دوم، بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۱۶۵]

مولانا ضیاء الحسن علوی [۱۹۴۵ء — ۱۸۹۱ء] کی 'یاد ایام' کی کل جمع پونجی ۸۴ صفحے ہیں۔ جس میں مختلف مقامات پر ذکر شبلی کے علاوہ یکجا ۲۸ صفحات پر ان کا مسلسل ذکر ہے۔ علوی صاحب بھی شبلی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ اُنہوں نے اس کتاب میں اپنے استاد شبلی کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ ندوۃ العلما اور شبلی لازم ملزوم تھے۔ شبلی نے ندوہ کے لیے علی گڑھ اور حیدر آباد چھوڑا تھا اور از خود اپنا سکون غارت کیا تھا اور اسی لیے تو مولوی مسعود علی ندوی کے نام اپنے مکتوب میں قیام ندوہ کے ناخوش گوار ماحول کو 'سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا' بتایا تھا۔ مولانا ضیاء الحسن علوی لکھتے ہیں:

''سب کچھ لکھ گیا مگر اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذ علامہ کا ذکر کہیں براہ راست نہیں آیا۔ یہ ذکر تو خیر بعد کو اپنی جگہ پورا پورا ہوگا مگر اتنا تو سن ہی لیجئے، علامہ کو ندوہ سے دلچسپی تھی، مگر علماء کو ان سے دلچسپی کم تھی۔ ان کے نزدیک وہ علی گڑھ رہ کر ساقط الاعتبار ہو چکے تھے۔ تاہم حضرت مولانا محمد علی صاحب ان سے برابر مشورہ کرتے رہتے۔'' [یاد ایام، بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۱۷۵۔۱۷۴]

اور یہ بات دیگر ہے کہ وہی مولانا نے محترم شبلی میں 'روحانیت' کی کمی کی منصوبہ بند تشہیر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے۔

آج تاریخ ندوۃ العلما میں شبلی کی خدمات سے عمداً صرف نظر کیا گیا ہے، لیکن شبلی ایسے فدائے ندوہ ہیں کہ اس کی ترقی کے ہر کام کا نقطۂ آغاز انہی کی ذات سے ہوتا ہے۔ مولانا ضیاء الحسن علوی لکھتے ہیں:

''معتمد تعلیم کا اصلی کام تو تعلیم کی نگرانی تھی مگر کام چلانے کے لیے بڑی چیز روپیہ ہے۔ اس کی فراہمی، چلت پھرت والے شخص پر پڑ جاتی ہے۔ ہمارے علامہ کی شخصیت نے خود ان سب کاموں کو اپنے ذمہ لے لیا، لہذا ایک سر ہزار سودا ہو گیا۔ ملک میں اس کی تبلیغ، روپیہ فراہم کرنا، رسالہ الندوہ جو خود ان کی ایجاد تھا، چلانا اور ابتدا میں اس کو خود بھرنا، طباعت کی فکر اور نگرانی، شعر العجم کی تصنیف، یہ کیا کچھ کم مشاغل تھے۔'' [یاد ایام بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۱۷۷۔۱۷۶]

مولانا ضیاء الحسن علوی شبلی کی شعر العجم اور براؤن کی ادبیات ایران کے بارے میں مولوی عبد الرزاق کان پوری کے 'ظن' کو 'اثم' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''براؤن کی ادبیات ایران شائع ہوئی، اِدھر شعر العجم کا اشتہار ہو چکا۔ لوگ سمجھے کہ علامہ نے یہ خیال اسی سے لیا ہے، مگر اس سے پہلے شعر العجم بہت کچھ ہو چکی تھی، تاہم بے چین مصنف نے براؤن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھوا کر اس کا ترجمہ سن لیا، پھر کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ اس نے میرا کام نہیں کیا، حالاں کہ براؤن نے بعد کی جلدوں میں خود علامہ سے بڑے شکر و امتنان کے ساتھ بہت کچھ نقل کیا ہے۔ یہ جواب تھا ان لوگوں کا، جنہوں نے بدظنی کو دخل دیا۔ ان بعض الظن اثم۔ اس کے بعد شعر العجم کی تنقیدیں میرے نزدیک وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو الفرق اور الفاروق میں ہے''۔ [یاد ایام بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۱۸۱]

مولانا عبد الماجد دریا بادی [۱۹۷۷ء۔۱۸۹۲ء] کی 'آپ بیتی' بھی ذکر شبلی خوب خوب ہے۔ وہ شبلی کی تحریروں کے شیدائی

تھے۔لکھتے ہیں:

''۔۔۔کہنا چاہئے کہ میری تحریری و تصنیفی زندگی کی جان مولانا شبلی ہی تھے''۔ [آپ بیتی، بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۱۹۷]

وہ ابتدا میں شبلی کی تحریروں سے متاثر تھے، لیکن کننگ کالج میں آکر لاادریت، تشکیک اور لادینی کے سیلاب میں یہ تاثر قائم نہیں رہ سکا اور اُنہوں نے شبلی کی 'الکلام' پر ایک تفصیلی تنقیدی مضمون لکھا، جو 'ایک طالب علم' کے نام سے ماہنامہ الناظر لکھنؤ میں بالاقساط چھپا، یہ ۱۹۱۰ء کی بات ہے۔اس مضمون کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجود باری، رسالت وغیرہ پر تھی۔صرف آڑ مولانا کے نام کی تھی۔انداز چوں کہ شبلی ہی کا تھا یعنی بجائے مناظرانہ ومجادلانہ کے علمی وادبی، اس لئے شہرت بھی ہوئی اور نفس بھی موٹا ہوا۔الناظر کے ایڈیٹر صاحب خود بڑے دیندار و عبادت گذار تھے، لیکن شبلی سے ناخوش رہتے۔اس لئے ایسے ملحدانہ مضمون کو بھی خوشی خوشی چھاپ دیا۔راز داری اس مضمون کے لئے خاص طور پر رہی اور لوگ برابر اسی کھوج میں لگے رہے کہ لکھنے والا کون ہے''۔ [آپ بیتی بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۱۹۹]

اس مضمون کی اشاعت پر شبلی بھی 'ان بعض الظن اثم' کا شکار ہوئے اور ناحق اپنے شاگرد مولوی عبدالحق پر 'ظن' کر گئے۔جس کا اظہار اُنہوں نے مہدی افادی کے نام اپنے ایک مکتوب میں کیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مضمون عبدالماجد دریابادی کا ہے۔تاہم شبلی کی بزرگانہ شفقت ان پر پہلے کی طرح ہی رہی۔بعد میں شبلی نے جب سیرت النبی پر کام کا آغاز کیا تو انگریزی مصادر سے لوازمے کی فراہمی کے لیے عبدالماجد دریابادی کو جز وقتی ملازمت کے لیے منتخب کیا، لیکن اللہ مغفرت فرمائے اس مولوی کی، جس نے نواب سلطان جہاں بیگم کو لکھ بھیجا کہ 'مولوی شبلی تو ایک ملحد کی اعانت سے کتاب تیار کر رہے ہیں'۔اور اس طرح مولانا عبدالماجد دریابادی اس بڑے منصوبہ سے تعلق باقی نہیں رہا۔تاہم اسی سیرت النبی کے مطالعہ نے ان کو الحاد سے نکالا، جس کا اعتراف اُنہوں نے اس آپ بیتی میں کیا ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے الناظر کے ایڈیٹر پر، جن کی دینداری اور عبادت گذاری کی گواہی ہمارے مولانا عبدالماجد دریابادی دیتے ہیں، وہ شبلی سے اس درجہ ناخوش ہیں کہ ایسے ملحدانہ مضمون کو خوشی خوشی چھاپ دیتے ہیں۔یعنی شبلی سے ناخوشی میں الحاد کی تشہیر ان کے یہاں جائز، اس پر بھی دینداری اور عبادت گذاری کا ٹھپہ۔آہ مظلوم شبلی! اللہ آپ کو جنت میں بلند مقام عطا کرے۔

'آشفتہ بیانی میری' میں رشید احمد صدیقی [۱۹۷۷ء۔۱۸۹۴ء] نے متعدد مقامات پر شبلی کی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے، لیکن ان کو پڑھنے کے بعد ایک آنچ کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔غالباً اسی لیے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو لکھنا پڑا:

''آشفتہ بیانی میری' میں رشید صاحب نے عظمتِ شبلی کا اعتراف کیا ہے۔ان کے مورخانہ شعور اور ان کی شاعری کے حسن اور ان کے ذوق جمالیات کی داد دی ہے، مگر ان کے بیان میں کسی قسم کی انفرادیت دکھائی نہیں دیتی اور شبلی سے ان کا لگاؤ ذرا کم کم محسوس ہوتا ہے''۔ [آشفتہ بیانی میری بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۲۱۴]

مرزا احسان احمد [۱۹۷۲ء۔۱۸۹۵ء] کے والد مرزا محمد سلیم کے شبلی اور ان کے خانوادے کے گہرے مراسم تھے۔مرزا احسان احمد نے بھی اپنے بچپن میں شبلی کو دیکھا تھا، بعد میں انہوں نے ان کی تحریروں کو شعوری آگہی کے ساتھ پڑھا بھی تھا۔شبلی پر ان کے دو طویل مقالات 'علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر' اور 'علامہ شبلی بحیثیت محقق ونقاد' نے ادبی علمی دنیا کو اپنی طرف متوجہ بھی کیا تھا۔بعض اہلِ علم کو تو ان کی تحریروں میں شبلی کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی تھی۔انہوں نے 'میں اور میری ادبی صلاحیت' میں شبلی کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں ہوسکتی، اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ میرے ناچیز قلم کو نثر نگاری کا جو کچھ سلیقہ ہات آیا ہے، وہ سب علامہ شبلی ہی کے عدیم المثال طرزِ انشا کے مطالعہ اور تتبع کا غائبانہ فیض ہے''۔ [میں اور میری ادبی صلاحیت بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۲۲۰]

ظفر احسن بیگ [۱۹۸۹ء۔۱۸۹۵ء] شبلی کے قدر دانوں میں تھے۔اُنہوں نے شبلی اور ان کے علمی آثار کو ان کے پسندیدہ ملک

ترکی میں متعارف کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ان کی لسانی وساطت اور تحریک سے شبلی کی متعدد کتابیں ترکی زبان میں منتقل ہوئیں۔جن کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب 'خاطرات' میں بڑی عقیدت اور مسرت کے ساتھ کیا ہے۔یہ کتاب شبلی کی علمی فتوحات کی توقیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

'غبار کارواں' جو مولانا سعید احمد اکبر آبادی [۱۹۸۵ء۔۱۹۰۸ء] کی زندگی کا اجمالی مرقع ہے۔اس میں ذکر شبلی ایک نئے تناظر میں ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میرے شعبہ میں کوئی طالب علم پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتا ہے تو اس کو شروع کے دو تین مہینوں میں مولانا شبلی کی خاص خاص کتابیں غور اور توجہ سے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے وقت کس کس طرح کے مختلف اجزاء اور عناصر کا تجزیہ کر کے، ہر چیز الگ الگ بحث کی جاتی ہیو اس کے لئے اسلوبِ نگارش کس قسم کا ہونا چاہئے۔'' [غبار کارواں بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۲۳۶]

وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب [انور شاہ کشمیری] نے مجھ میں جس علمی و تحقیقی ذوق کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری مولانا شبلی کی کتابوں نے کی۔'' [غبار کارواں بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۲۳۶]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۱۹۹۹ء۔۱۹۱۳ء] کی خود نوشت 'کاروان زندگی' سات جلدوں پر مشتمل ہے۔اس میں اُن کی ۸۸ سالہ زندگی کے تمام سوانحی، علمی، تعلیمی، تصنیفی اور دعوتی حالات او رواقعات درج ہیں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اس کتاب میں ذکرِ شبلی کے تناظر میں لکھتے ہیں:

''اکاروانِ زندگی کی سات جلدوں میں براہ راست شبلی ذکر بہت کم آیا ہے۔جہاں ذکر آیا ہے ضمناً آیا ہے۔حالاں کہ مولانا علی میاں نے دیگر محسنین ندوہ کا ذکر وضاحت سے کیا ہے، تاہم جو ہے سو ہے''۔ [کاروانِ زندگی بحوالہ شبلی خودنوشتوں میں، ص ۲۴۰]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [مولانا علی میاں] کی اس کتاب میں ضمنی طور پر ہی سہی، جب بھی اور جہاں بھی شبلی ذکر آیا ہے، وہاں شبلی کے بلند قد کو 'کوتاہ' ثابت کرنے کی منصوبہ بند کوششیں کی گئی ہیں اور عمداً الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں، جو مختلف سمتوں میں کھلنے کا رجحان رکھتے ہوں۔شبلی کے ضمنی بیانیے میں طلباء ندوہ میں ان کی مقبولیت کو ایک نیا رنگ دینے اور نئے مفاہیم عطا کرنے کے اور غیر حقیقی، بلکہ غیر شرعی اور غیر روحانی طور طریقے اختیار کرنے، بلکہ ہت کنڈے اپنانے سے بھی گریز نہیں کیا گیا ہے، جو کسی بھی طور ایک متبحر عالم دین کے شایانِ شان نہیں۔مولانا علی میاں اور ان کے ہم مزاجوں کا یہ رویہ علمی، دینی اور روحانی روایت کے منافی ہے اور ہر عدالت میں علی رؤس الاشہاد نہ صرف لائق مذمت، بلکہ قابلِ مواخذہ بھی ہے۔اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کو صدق وصفا سے بھر دے۔

یہاں ہم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے اس طویل اقتباس کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

''دراصل اُس وقت ندوہ سے جو افراد وابستہ تھے۔کوئی شخص علم و فضل میں علامہ شبلی کا مدمقابل نہ تھا۔پھر طلبہ، اساتذہ بلکہ تمام اشخاص دیکھ رہے تھے کا ندوہ کا دستور العمل وہ تیار کریں، نصابِ تعلیم وہ بنائیں اور امراء و رؤسا سے مل کر بڑی بڑی رقمیں وہ لائیں، زمین وہ حاصل کریں، دارالعلوم کا نقشہ وہ بنائیں، تعمیرات کے لیے جدوجہد وہ کریں، طلبہ کے مسائل وہ حل کریں، اور علیم و تعلم میں وہ حاضر رہیں، ماہنامہ الندوہ وہ نکالیں، فکرِ ندوہ کی ترجمانی وہ کریں، مخالفینِ اسلام اور مخالفینِ ندوہ کے جواب دیں، تحریک اشاعتِ اسلام کی قرارداد وہ پیش کریں۔وقف علی الاولاد کے لیے پورے ہندوستان کے علماء اور قانون دانوں میں حرکت وہ پیدا کریں، شدھی تحریک کے سدباب کے لیے سراپا غیرت وہ بن جائیں، غالباً یہی وجوہ ہیں جن کے سبب نہ صرف طلبہ واساتذہ بلکہ پورا ہندوستان شبلی اور ندوہ کو لازم وملزوم سمجھتا تھا''۔[شبلی خودنوشتوں میں، ص ۲۴۳۔۲۴۲]

مولانا مجیب اللہ ندوی [۲۰۰۶ء۔۱۹۱۸ء] کی خودنوشت 'نقوشِ زندگی' میں بھی ذکر شبلی ہے۔وہ گرچہ شبلی کی وفات کے چار سال بعد عالم وجود میں آئے، لیکن شبلی کے خوشہ چینوں میں تھے۔اُنہوں نے شبلی کو تمام تر ذہنی استحضار اور فکری ارتکاز کے ساتھ پڑھا تھا اور اپنا پہلا

مقالہ 'کیا غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کی شکست ہوئی تھی؟' کے نام سے لکھ کر علمی دنیا کو احساس دلا دیا تھا کہ شبلی ان کے رہنما ہیں۔

ہم بار بار لکھتے ہیں کہ شبلی میں روحانیت کی کمی کی تشہیر روحانیت سے سرشار طبقے نے بڑے منظم انداز میں اور سازشی سوچ کے ساتھ کی تھی۔ اسی طرح کے ایک واقعہ سے مولانا مجیب اللہ ندوی کو بھی روبرو ہونا پڑا تھا۔ بات ۱۹۴۵ء کی ہے۔ اس وقت مولانا مجیب اللہ ندوی کی عمر ۲۷ سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ گجرات کے سفر پر تھے۔ راندیر میں قیام رہا۔ سید صاحب سے ملاقات کے لیے مولانا محمد یوسف بنوری [۱۹۷۷ء۔۱۹۰۸ء] راندیر تشریف لائے۔ ایک مجلس میں مولانا بنوری نے اپنا ایک خواب بیان کیا، جو مولانا مجیب اللہ ندوی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

'' ایک مجلس میں مولانا بنوری نے ایک لمبا چوڑا خواب بیان فرمایا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُنہوں نے دیکھا کہا یک پہاری ہے، اس پہاڑی کے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف شبلی اور کچھ لوگ ہیں، جو مشقت سے جنت کی جانب جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ خواب سن کر سید صاحب تو خاموش رہے، مگر مجھے غصہ آ گیا اور ادب کے دائرے سے باہر ہو کر میں نے عرض کیا کہ مولانا معاف کیجئے گا۔ آپ حضرات کو چوں کہ علامہ شبلی کے ساتھ حسن ظن نہیں ہے، اس لیے آپ لوگوں کو اس طرح کا خواب نظر آتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے جس پُر شور جذبہ سے سیرت نبوی ﷺ کی تدوین شروع کی اور پھر اس کی تکمیل کے بعد اُنہوں نے اس پر حُبِ نبوی ﷺ میں ڈوبا ہوا جو والہانہ سرنامہ لکھا اور جو قطعہ کہا۔ جنت کے فرشتوں نے جب اسے کراماً کاتبین سے سنا ہوگا یا ان کا نوشتہ پڑھا ہوگا تو فوات کے ساتھ ہی اذنِ الٰہی کے بعد اپنے جلو میں لے جا کر جنت میں ان کے مقام بلند کی سیر کرا دی ہوگی، اس لئے مشقت سے جنت میں جانے کے خواب کو اضغاث احلام [خوابِ پریشاں] ہی کہا جا سکتا ہے۔ میرا رُخ دیکھ کر سید صاحب نے چپ رہنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ فرمایا اور گفتگو کا رُخ پھیر دیا''۔

[نقوش زندگی بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۲۶۰۔۲۵۹]

شبلی کی سیرت النبی اس وقت تک روحانیت کے سکہ بند پیشواؤں نے اس وقت شاید ہی پڑھی ہو، تاہم اس طرح کے خوابوں سے اپنے جہانِ پیری مریدی کو آباد کرنے کا اُنہیں خدائی حق حاصل ہے۔ انہیں اس سے ذرا بھی سروکار نہیں کہ کس کی کردار کشی ہو رہی ہے۔ اب انہیں کون بتائے کہ اسلام اپنی فکر اور اپنے نظریے کی وجہ سے قائم ہے، ان جیسے خوابوں اور ان کی خوش کن تعبیروں سے نہیں۔

حافظ نذر احمد [۲۰۱۱ء۔۱۹۱۹ء] شبلی کے شیدائیوں میں تھے۔ 'سرگذشت ایام' میں اُنہوں نے شبلی کو ادارہ ساز بتایا ہے اور ان کے تفردات اور علمی فتوحات کو اپنی عملی زندگی میں برتا ہے۔ وہ پاکستان میں شبلی کے سب سے بڑے شیدائی تھے۔

پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی [پیدائش: اپریل ۱۹۲۴ء] کی 'دھوپ چھاؤں' میں شبلی ذکر بار بار آیا ہے۔ وہ شبلی کی عبقریت کو شبہے سے بالاتر بتاتے ہیں۔ شبلی کے خطوط پر دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ان کا توسیعی خطبہ بے حد اہم ہے۔

'حکایتِ ہستی' مولانا اعجاز احمد اعظمی [۱۹۵۱ء۔۲۰۱۳ء] کی خود نوشت کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں ذکر شبلی بھی ہے اور فکر شبلی بھی۔ وہ شبلی کی تحریروں کے شیدائی تھے، لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کا مطالعہ کے باب میں میرے اُوپر بڑا احسان ہے۔ ان کی زندگی سے، ان کی کتابوں سے اور ان کے مقالات سیمیں نے مطالعہ کرنا سیکھا۔ بات کو سمجھنا سیکھا۔ عمدہ طرز میں بیان کرنا اور لکھنا سیکھا، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے''۔

[حکایت ہستی بحوالہ شبلی خود نوشتوں میں، ص ۲۹۰۔۲۸۹]

'مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں' دراصل الندوہ کے تیسرے دور اجراء کی دین ہے۔ یہ مختلف اہل علم کے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں ان کی محسن کتابیں زیر بحث آئی ہیں اور جس کو افادۂ عام کے مقصد سے مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری [وفات: ۲۲/ اکتوبر ۱۹۸۶ء] نے ۱۹۴۶ء میں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس میں حبیبِ شبلی مولانا حبیب الرحمن شروانی [۱۹۵۰ء۔۱۸۶۷ء]، جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی [۱۹۵۳ء۔۱۸۸۴ء]، مولانا عبد الماجد دریابادی [۱۹۷۷ء۔۱۸۹۲ء]، میاں بشیر احمد [۱۹۷۱ء۔۱۸۹۳ء]، پروفیسر بدرالدین علوی [۱۹۶۵ء۔۱۸۹۳ء]، مولانا سید طلحہ ایم اے [۱۹۷۰ء۔۱۸۹۰ء]، مولانا

احمد سعید اکبر آبادی[۱۹۸۵ء۔ ۱۹۰۸ء]، پروفیسر سید نواب علی[۱۹۶۱ء۔۱۸۷۷ء]،مولانا عبدالسلام ندوی[۱۹۵۶ء۔۱۸۸۳ء] اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی[۱۹۹۹ء۔۱۹۱۳ء] کے مضامین شامل ہیں۔جن میں کسی نہ کسی طور ذکر شبلی ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی اس کتاب کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اُنہوں نے ان خودنوشتوں اور ان کے مصنفین کا تعارف اتنی جامعیت سے کرایا ہے کہ چند سطروں میں یہ خودنوشتیں اپنی تمامتر کیفیات کے ساتھ قاری پر واضح ہوجاتی ہیں۔اس کتاب کا دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ کسی بھی مرحلے میں شبلی کے وکیل صفائی نہیں رہے ہیں۔ بلکہ جو بھی لکھا ہے وہ معقول دلائل اور مضبوط شواہد کی روشنی لکھا ہے اور شبلی شناسی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔شبلیات کے حوالے سے یہ کتاب بڑی اہم ہے۔

عروسہ عرشی۔کلکتہ

بابری مسجد کے نام

دشمن اسلام نے توڑا خدا کا پاک گھر
چھ دسمبر کی تھی وہ تاریخ وقتِ دوپہر
ہند کے آئین کو ٹھکرا کے آگے بڑھ گئے
بابری مسجد کے گنبد پر ستمگر چڑھ گئے
چند لمحوں میں خدا کے گھر کی مسماری ہوئی
اتنا بھی آساں نہ تھا دو سال تیاری ہوئی
چھ دسمبر ہے ہمارے واسطے یوم سیاہ
ہاں اسی دن کی تھی دہشت گردوں نے مسجد تباہ
یوں تو سپرم کورٹ نے مانا ہے مسجد کا وجود
پر بضد ہے آستھا کے نام پر نسلِ ہنود
فیصلہ حاکم کا کب آیا وہ تھا اک مشورہ
بابری مسجد کو دے سرکار پانچ ایکڑ جگہ
جیت کر یہ کیس عرشی کس لیے بارے ہیں ہم
آج بھی اس ملک میں انصاف کے مارے ہیں ہم

پرینکا رڈّی

اب زور اقتدار سلامت نہیں رہا
کیا مرد کوئی دور حکومت نہیں رہا
سڑکوں پہ لوگ پھرتے ہیں اپنی ہوس لیے
وحشت کے ناگ ہیں یہ جسے پائے ڈس لیے
حالات کر نہ پائیں گے اس زخم کو رفو
کیوں لٹ گئی پرینکا رڈّی کی آبرو
تنہا پرینکا تھی وہ قاتل تو چار تھے
سچ کہہ رہی ہوں وہ تو بڑے ہوشیار تھے
عزت سے پہلے کھیلے پھر ایسا صلہ دیا
بے ہوش تھی پرینکا اس کو جلا دیا
آخر یہ عورتوں پہ ستم کیوں ہے صبح وشام
کیا بات ہے جو جاری ہے اس طرح انتقام
بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ یہ تذکرہ
اب ہیچ لگ رہی ہے حکومت کی یہ صدا
ہر گز نہ سوچئے دل عرشی میں غم نہیں
ہر لڑکی جانتی ہے تحفظ میں ہم نہیں

ڈاکٹر مسعود جعفری۔حیدرآباد

مولانا آزاد کی سیاسی کیمیا

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت منفرد اور پر کشش تھی۔ان کے قلم میں جادو اور زبان میں غضب کی تاثیر تھی۔وہ بولتے تو لوگ ان کے زور خطابت میں کھو جاتے تھے۔وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔وہ صف اول کے مجاہد آزادی تھے۔گاندھی و نہرو کے ہمسر تھے۔ان کا علمی تبحر گہرا تھا۔ان کی ایک تصنیف انسانیت موت کے دروازے پر معرکہ آرا رہی ۔وہ فلسفیانہ نکات سے بھری ہوئی ہے۔کربلا کے المیہ کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مولانا کی اسلامی تاریخ پر عمیق نظر تھی۔ Pan Islamic تحریکوں سے بھی واقف تھے۔ان کی نثر اردو میں صبح بہاراں کی مانند تھی۔ نئی لفظیات ،نئے محاورے،چست بندشیں،جدید تراکیب،فکری عمق قاری کو مبہوت کر دیتا تھا۔لفظ لفظ معنی آفرینی کی کائنات سمیٹے ہوتا تھا۔ایسا طرز نگارش نہ پہلے تھا اور نہ ان کے بعد رہا۔ اس زمانے کے سبھی سیاسی رہنما اخبار نکالتے تھے۔مسز اینی بیسینٹ انگریزی میں Common wea یعنی مشترکہ غم شائع کرتی تھیں۔پنڈت نہرو National Herald نکالتے تھے۔مہاتما گاندھی Young India کے زریعہ اپنے تصورات کی اشاعت کرتے تھے۔مولانا آزاد نے الہلال و البلاغ جیسے اخبار جاری کئے۔ یہ اخبار نہیں صور اسرافیل تھے۔ملک وقوم میں آزادی وحریت کی روح دوڑا دیئے۔ مولانا نے صحیفہ نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب بپا کر دیا۔لوگ کوسوں چل کر بک اسٹال سے الہلال خرید کر پڑھتے ایسے انہماک اور محویت سے پڑھتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ یہ آزاد کا اعجاز قلم تھا کہ اس نے ایک عالم کو اپنا رسیا و گرویدہ بنالیا تھا۔نہرو گاندھی انہیں مولانا صاحب کہتے تھکتے نہیں تھے۔مولانا آزاد کی شمولیت سے تحریک آزادی میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔جب سودیشی اندولن کا آغاز ہوا اور آزاد نے بنگال میں سودیشی مصنوعات کی اہمیت کو واضح کیا تو پارچہ جات کے تاجر بدیشی کپڑوں کو نذر آتش کرنے لگے۔یہ سب آزاد کی شعلہ نوائی کا نتیجہ تھا۔مولانا نے 1919 کی خلافت تحریک اور رولت ایکٹ کے خلاف چلنے والی عوامی تحریک میں حصہ لیا تھا۔کلکتہ میں جولائی 1921 میں ترک موالات کے سلسلہ میں ہونے والے جلسہ میں مولانا نے ایک جوشیلی تقریر کی تھی۔انگریز حکومت نے اسے بغاوت سے محمول کیا اور انہیں گرفتار کیا گیا۔کلکتہ کی علی پور جیل میں رکھا گیا۔ یہ مقدمہ ایک سال تک چلا اور 9 فروری 1922 کو ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ مولانا نے ایک بیان عدالت میں داخل کیا تھا۔اسے تاریخ میں قول فیصل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔مولانا کے جرات آمیز فقرے ملاحظہ کیجیئے۔

مورخ ہمارے انتظار میں ہے۔اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔

ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو۔تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔وقت اس کا جج ہے۔وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد ایک جید عالم دین و مذہب، ایک آتش نفس خطیب، ایک پایہ کے صحافی، عہد آفریں انشا پرداز، بہترین شاعر، سماجی ، سیاسی جہد کار تھے۔ عربی، فارسی و اردو کے مستند قلمکار تھے۔ آزاد کے روبرو دو بڑی منزلیں تھیں۔

آزادی، غیر منقسم ہندوستان

اولاذکر مقصد کے حصول میں کامیاب رہے۔ منزل دوم کی بازیابی میں بری طرح ناکام رہے۔

کامیابی و نامرادی کے کئی اسباب و علل تھے۔ جذبہ آزادی سے سارا برصغیر ہند سرشار تھا۔ غیر منقسم ملک کے لئے ساکنان ہند کی رائے بٹ گئی تھی۔ کانگریس کے چوٹی کے قائدین جیسے سردار پٹیل، پنڈت نہرو، کرپلانی ملک کے بٹوارہ کے حق میں کھڑے ہوگئے تھے۔ انگریزی آقا بھی ملک کی تقسیم کی تائید میں تھے۔ تقسیم ہند کے لئے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کا نقطہ نظر ایک تھا۔

شروع شروع گاندھی جی متحدہ ہندوستان کے نظریہ کے قائل تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ملک کی تقسیم ان کی لاش پر ہو سکے گی۔ انہوں نے جناح سے ممبئی میں ستمبر 1944 میں ویسرائے لارڈ واویل کی ایما پر سترہ دن تک بات چیت کی۔ جناح کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جناح اپنے موقف پر چٹان کی طرح اٹل رہے۔ یہ طویل بات چیت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی۔ گاندھی جناح Talks Utterly Failed رہی۔ شیرنی کے بجائے تلخیاں اور بڑھیں گاندھی جی نے عید سعید کی خوشی پر اپنے ہاتھ سے شیر خرمہ بنا کر اپنے گھر سے جناح کو کھلانے چلے تھے۔ یہ ساری خیر سگالی کی تدبیریں ناکام ہوگئیں۔۔ مولانا آزاد کے متحدہ ہند کے تصور کو گہن لگنے لگا۔ وہ اپنی راہ پر رواں دواں رہے۔ مولانا آزاد ایک Idealist عینیت پسند تھے۔ وہ زمینی جڑوں سے کٹتے چلے گئے۔ تقسیم کے سیلاب میں مولانا آزاد کی سیاسی تعبیریں، تاریخی استدلال، اسلامی تاویلیں سب دھری کی دھری رہ گئیں۔ وقت کا عفریت ہر خوشہ علم و آگہی کو روندتا چلا گیا۔

مولانا آزاد نے انگریزوں اور برہمنوں کے ذہن کو پڑھنے اور سمجھنے میں چوک کی۔ وہ اپنے دیرینہ رفیق اور سیاسی ہمسفر نہرو کو معصوم اور سیدھا سادھا سمجھتے رہے۔ نہرو ملک کے بٹوارے کو مسلم لیگ سے چھٹکارہ پانے کا سنہری موقع سمجھتے تھے۔ متحدہ ہندوستان کی مہم میں آزاد اکیلے پڑ گئے تھے۔ بقول فرایہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ سات مسافروں سے کہو ان کی رہگزر آئی مولانا کے خیالات میں افلاطونیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا رشتہ ارضی واقعات سے ٹوٹ چکا تھا۔ مولانا پہلی جنگ عظیم کے بعد ہونے والی ایشیائی سیاسی و جغرافیائی تبدیلیوں کو یکسر بھول چکے تھے۔ سلطنت عثمانیہ Ottoman Empire کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ نجد، عراق، سیریا فلسطین، یونان، بلغاریہ، چیکوسالواکیہ، آرمینیہ، جارجیا و دیگر آزاد ریاستیں معرض وجود میں آچکی تھیں۔ ترکی ایک جمہوریہ Republic State بن چکا تھا۔ خلافت کا نظام مکمل طور پر برخواست ہو چکا تھا۔ ایشیا میں یہ سب تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور مولانا آزاد تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی شدومد کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے۔ وہ تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتے تھے نہ اسے روک سکتے تھے۔ تعجب تو اس امر پر ہے کہ وہ آٹومن ایمپائر کی ہسٹری کو پس پشت ڈال دئے تھے۔ وہ نوشتہ دیوار پڑھنے سے قاصر تھے۔ مولانا آزاد کا ایک ملک کا نظریہ اس لئے ہار گیا کہ وہ نئے ابھرتے ہوئے قومیت کے جوش و خروش کو محسوس نہیں کر رہے تھے۔ اسی لئے ان کی آواز صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی تھی۔ 47 کے بعد ان کا سیاسی و مذہبی اثر ختم ہو چکا تھا۔ ان کی

حکمت عملی، طرز فکر فیل ہو چکی تھی۔ان کے اپنوں نے انہیں فریب دیا تھا۔ان کی اخلاقی جسارت بھی مجروح ہوگئی تھی۔اسی لئے انہوں نے اپنی انگریزی تصنیف India Wins Freedom کو مہر بند کر دیا تھا۔وصیت کی تھی کہ اسے ان کی وفات کے بعد کھولا جائے۔جب وہ کتاب طشت از بام ہوئی تو تو ملکی سیاسیات میں کوئی بھونچال نہیں آیا۔اس کتاب کا کوئی نوٹس بھی نہیں لیا گیا۔آزاد کے عزیز واقارب سیاست میں آئے لیکن ان کا کوئی خاص رول نہیں رہا۔ایک زمانے میں آزاد کے مرید اور مداح انہیں امام الہند بنانے کی تحریک چلا رہے تھے۔امام ہند تو دور رہا وہ وزیر داخلہ تک نہیں بن سکے۔آزادی کے بعد ان کا کوئی بڑا رول نہیں رہا۔ان کے تعلیمی قلمدان پر نہرو مسلط رہے۔

مولانا آزاد نہرو یا سردار پٹیل کو حیدرآباد پر پولیس ایکشن کرنے سے روک بھی نہیں سکے۔آزاد اردو کے ایک سرکردہ ادیب ہوتے ہوئے بھی عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو کو برخواست کرنے کے فیصلہ کو رکا نہیں سکے۔ان کی آنکھوں کے سامنے اردو کی نادر و نایاب کتابیں تباہ و تاراج ہوگئیں۔آزاد کے منہ سے اک سرد آہ تک نہیں نکلی۔

(بقیہ، ص:۳۷ کا).....

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

عقل زماں ومکاں کی پابندی جب کے عشق زبان ومکاں کی حدود سے نکل کر اُس عالم نا محدود میں پہنچ جاتی ہے۔جہاں حقیقت بے حجاب ہوتی ہے۔یہ محروف کا مقام ہے عقل کی منزل مقصود ہستی مطلق کی معروف وہ خدا جو ہے لیکن اس کی جستجو نا تمام ہے۔عشق خانما ہے۔جو راہ طلب میں عقل کی رہبری کرتا ہے عشق خدا نما ہے۔گویا اقبال کے نزدیک عقل اور عشق میں بنیادی تضاد اتنا زیادہ نہیں بل کہ ابتدائی مراحل پر تو عقل کی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے ہفت لسانی دوروزہ عالمی سیمینار کے موقع پر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی کی مرتب کردہ کتاب ''قوت تعلیم افکار ونظریات کی رسم اجرا کرتے ہوئے مولانا رحیم الدین انصاری، پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ڈاکٹر محمد نعمان، پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، حضرت رحمٰن جامی، جسٹس اسماعیل، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر عبدالقدوس، غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اقبال فہمی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

مفردات

تہی: خالی۔ کسی چیز پر قناعت کرنا: اس چیز کے سوا کسی دوسری چیز کی خواہش و کوشش نہ کرنا۔ عالم رنگ و بو: آخرت سے پہلے کی دنیا یعنی وہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ آہ و فغاں: رونا دھونا، گریہ زاری کرنا۔ راز داں: راز جاننے والا۔

شرح

یہ اقبال کی مشہور و مقبول غزلوں میں سے ایک ہے، اس میں تخیل کی بلندی بھی ہے اور صوت و آہنگ کی نغمگی بھی، یہ ایک مربوط و مسلسل غزل ہے، یہ پوری غزل ایک مرکزی خیال کے اطراف گھومتی ہے، وہ مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان پست ہمتی سے نا آشنا ہو کر بلند حوصلگی کے ساتھ جہد مسلسل اور عمل پیہم میں مصروف رہے، اس مرکزی خیال کو پھیلا کر یوں کہہ سکتے ہیں کہ حیات دو روزہ پر قانع نہ ہو کر آخرت کی فکر کرنا اور اس دنیا میں فکر و عمل کے سفر کو مسلسل جاری رکھنا۔ نہ کسی کامیابی کو اپنی منزل سمجھ کر سفر منقطع کرنا اور نہ کسی ناکامی پر کبیدہ خاطر ہو کر ہمت ہار جانا۔ اس مرکزی خیال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک یہ کہ یہ زندگی فانی ہے اس کے بعد کی زندگی ابدی و دائمی ہے، دوسرے یہ کہ اس فانی دنیا میں بہت سی کامیابیوں اور ناکامیوں سے گذرنا پڑتا ہے، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے عزائم ہمیشہ بلند رکھے، اپنی پرواز اونچی رکھے، تعب و تھکن سے نا آشنا اپنا سفر جاری رکھے۔ موجودہ دور کی اصطلاح میں اس غزل کو موٹیویشنل Motivational غزل کا نام دیا جا سکتا ہے، یہ غزل آفاق پیمائی کا سبق پڑھاتی ہے، عزائم کو ہم دوش ثریا کرتی ہے، پست ہمتی اور نا امیدی سے دور رکھتی ہے۔ یہ اس غزل کی ایک عمومی توضیح ہوئی، اب ہر شعر کی مختصر تشریح درج ذیل ہے:

۱۔ ستاروں سے آگے جہاں ہونے کا ایک سائنسی اور حقیقی مفہوم ہے، اور وہ یہ کہ ہماری آنکھیں ستاروں سے

آگے کسی کرے اور گولے کو نہیں دیکھتیں تو یہ گمان گذرتا ہے کہ شاید دنیا ان ستاروں پر ختم ہو جاتی ہے، ان ستاروں سے پرے نہ کوئی جہاں ہے نہ مکاں، جب کہ یہ ہماری بصارت کا دھوکہ ہے، صحیح یہ ہے کہ ان ستاروں سے آگے بھی کئی جہاں آباد ہیں۔ یہ تو اس کا ظاہری مفہوم ہوا، لیکن یہاں مجازی مفہوم مراد ہے، اقبال نے نگاہ بصارت سے نگاہ بصیرت کو تشبیہ دی ہے، اور ستاروں سے فکر وعمل کی معنوی جولان گاہیں اور منزلیں مراد ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر تمہارا طائر فکر وعمل فلک پیمائی کرتا ہوا ستاروں تک بھی پہنچ جائے تو بھی اپنی پرواز منقطع مت کرنا بل کہ سفر جاری رکھنا اور ستاروں سے آگے کا جہاں تلاش کرنے کے لیے آفاق پیمائی شروع کر دینا، دوسرے مصرع میں اقبال نے عشق کا لفظ استعمال کیا ہے، عشق سے مراد اقبال کے یہاں عشق حقیقی ہوا کرتا ہے، اقبال کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کی راہ آزمائشوں سے پر ہے، یکے بعد دیگرے آزمائشیں آتی رہتی ہیں، اگر کوئی آزمائش گذر جائے تو تن آسانی کی طرف مائل نہیں ہو جانا چاہیے کہ اس سے عشق کمزور پڑ جاتا ہے، اسی طرح آزمائشوں سے گھبرا کر پیچھے نہیں ہٹ جانا چاہیے، بل کہ آزمائشوں کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے تا آں کہ معشوق حقیقی سے وصال ہو جائے۔

۲۔ اس شعر کا بھی ایک سائنسی مفہوم ہے وہ یہ کہ یہ فضائیں جو بہ ظاہر زندہ وجود سے خالی نظر آتی ہیں وہ حقیقت میں خالی نہیں ہیں، بل کہ پرندوں، پتنگوں اور جرثوموں سے آباد ہیں، ان میں لاتعداد زندہ مخلوقات تیر رہی ہیں، یہاں اس شعر میں اقبال نے اس سائنسی مفہوم کے بجائے مجازی مفہوم مراد لیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ فکر وفن کی فلک پیمائی کے لیے یہ جو تمہارے سامنے کھلا آسمان ہے اور اشہب فکر وعمل کی شہ سواری کے لیے جو تمہارے سامنے میدان ہے وہ زندگی اور زندہ لوگوں کی موجودگی سے خالی نہیں ہے، عزم کو بال وپر لگاؤ اور پھر دیکھو کے ان فضاوں میں زندگی کا سامان بھی ہے اور زندہ وجود کا رواں دواں کارواں بھی، اگر ایک کارواں سے تم بچھڑ گئے تو بھی افسوس کی کوئی بات نہیں ہے، یہاں سینکڑوں کارواں محو سفر ہے۔

۳۔ یہ شعر اس غزل کے دیگر اشعار کی بہ نسبت زیادہ واضح ہے، اس شعر میں اقبال نے ہماری توجہ اخروی دنیا کی طرف مبذول کی ہے اور اس دنیا کے بے ثباتی کی طرف اشارہ کر کے اس سے دل نہ لگانے کی بات کہی ہے، اقبال کہتے ہیں کہ اس دنیائے فانی پر قناعت نہ کرو، یعنی اپنی ساری کوششوں اور خواہشوں کا محور ومنتہی اس دنیائے فانی کو نہ بناؤ کہ اس جہاں کے بعد ایک اور جہاں ہے، ایک اور چمن اور ایک اور آشیاں ہے۔

۴۔ اس شعر میں اقبال نے محبوب کے ہجر میں جینے کا ایک اصول بتایا ہے، اقبال کہتے ہیں کہ جس آشیانہ میں محبوب کو یاد کرنے کا معمول ہو وہ آشیانہ اگر اجڑ جائے تو اس آشیانے کے اجڑنے کے افسوس میں لگ جانا ایک سچی محبت کرنے والے شخص کو زیب نہیں دیتا، کیوں کہ آشیانہ اصل نہیں ہے؛ بل کہ محبوب کی یاد کو دل میں بسانا، دیدار محبوب میں تڑپنا، انتظار وصل میں بے چین رہنا، ہجر محبوب میں آنسو بہانا یہ اصل ہے۔ خلاصہ یہ کہ محبت کے باب میں محبوب کے ہجر میں آہ وزاری و بے قراری اصل ہے، بقیہ چیزوں کی حیثیت ثانوی درجہ کی ہے، بقیہ چیزیں اگر فوت بھی ہو جائیں، پژمردہ خاطر ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔

۵۔ شاہیں اقبال کا پسندیدہ پرندہ ہے، اس کی کئی خصوصیات ہیں جن میں سے ایک اہم خصوصیت بلند پروازی وآفاق گیری ہے، اقبال اپنے مخاطب سے کہتے ہیں، تو شاہینی صفات کا مالک ہے، اس لیے تو کبھی پرواز سے تھک کر اپنا سفر

منقطع مت کرنا؛ بل کہ اگر ایک آسمان طے ہو جائے تو دوسرے آسمان کا سفر شروع کر دینا، اس شعر کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ انسان جس میدان بھی کام کرے اسے ہمیشہ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیے، ترقی کے منازل طے کرتے رہنا چاہیے، کسی منزل پر پہنچ کر تھک ہار کر بیٹھ نہیں جانا چاہیے۔

۶۔ یہ شعر بھی نسبتا آسان ہے، یہ تیسرے شعر کے تقریبا ہم معنی ہے، اس شعر میں اقبال نے دنیوی زندگی میں نہ الجھنے کی نصیحت کی ہے، کیوں کہ یہ زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے، اس زندگی کے علاوہ ایک اور زندگی ہے جو اصل ہے، اصل زندگی سے غافل ہو کر فانی زندگی میں الجھ جانا عقل مندی کی بات نہیں ہے۔

۷۔ اس شعر میں اقبال اپنے زمانے کے مسلمانوں اور بہ طور خاص اپنے حلقہ سخن کے لوگوں سے کافی پر امید ہے، اقبال کہتے ہیں کہ وہ زمانہ چلا گیا جب لوگ میرے اشعار افکار کو اہمیت نہیں دیتے تھے، اب لوگ میری باتوں کو سمجھنے لگے ہیں، اور میرے رازوں جاننے لگے ہیں۔ اس غزل میں اقبال نے حالات سے مایوس نہ ہونے اور عزم کو جواں رواں مسلسل اپنے کام اور مشن سے جڑے رکھنے کی جو بات کہی ہے اس شعر میں اپنے اس پیغام کی مثال میں خود اپنے آپ کو پیش کیا کہ دیکھو ایک وقت تھا، جب لوگ میری باتوں پر کان نہیں دھرتے تھے، میری انقلابی فکر کو کج فکری سمجھتے تھے؛ لیکن ان سب کے باوجود میں اپنا کام کرتا رہا، میں نے اپنا مشن جاری رکھا، میں نا امید نہیں ہوا، پست ہمت نہیں ہوا، دل چھوٹا نہیں کیا، آج الحمد للہ لوگ میری باتیں سمجھنے لگے ہیں اور اہمیت دینے لگے ہیں۔

جامعة البنات الاصلاحية حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چار سال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمد ورفت کی سہولت ☆دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأة الصالحة" ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

ڈاکٹر مفتیہ رقیہ شکیل خان۔ حیدرآباد

زنا کی مذمت قرآن وحدیث کی روشنی میں

زنا کاری بدترین اور انتہائی رِذالت وکمینگی کی علامت ہے، زمانۂ جاہلیت میں دوسری اور قباحتوں کے ساتھ ساتھ زنا کا رواج بھی عام تھا اور اس کا ارتکاب بے دھڑک کیا جاتا تھا، پیشہ ور عورتیں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے اپنی اپنی دوکانیں سنوارتیں اور خود بن سنور کر لوگوں کو اس فعل قبیح کی دعوت دیا کرتی تھیں، اونچے اونچے جھنڈے اُن کے مکانوں پر لہرایا کرتے تھے، بے شرمی و بے غیرتی نے انہیں حیوان صفت بنادیا تھا لیکن اسلام نے روحانی اور اخلاقی تربیت کی تکمیل کے لئے اپنے ماننے والوں کو روز اول ہی سے زنا کی قباحت اور اس کے ذریعہ عام ہونے والی برائیوں سے خبردار کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ''وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيْلًا'' (پارہ:۱۵، سورہ: بنی اسرائیل، آیت:۳۲) اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ بیشک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ۔

زنا کا پہلا بنیادی سبب: دینِ اسلام ہی وہ خدائی قانون ہے جس میں معاشرہ کو تباہ و برباد کرنے والے تمام اسباب کی نشاندہی اور تمام ذرائع کا سدِّ باب کیا گیا ہے، معاشرے کے اندر زنا کاری عام ہونے میں بڑا دخل بے پردگی اور بدنگاہی کا ہوتا ہے، اسلام نے ان دونوں باتوں پر بندش لگائی، اوارگی اور بے حیائی کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے نگاہ کی حفاظت کا حکم دیا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ط ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ م بِمَا يَصْنَعُوْنَ'' (پارہ:۱۸، سورہ: نور، آیت:۳۰) (اے محبوب!) مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے بہت ستھرا ہے، بیشک اللہ کو ان کے کاموں کی خبر ہے۔

بدنگاہی چونکہ عورتوں کی طرف سے بھی باعث فتنہ ہے اس لئے انہیں بھی یہ حکم دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ'' (پارہ:۱۸، سورہ: نور، آیت:۳۱) اور مسلمان عورتوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی پارسائی کی حفاظت کریں۔

اللہ عزوجل اپنے پیارے محبوب ﷺ سے ارشاد فرما رہا ہے کہ اے محبوب! آپ فرمادیجئے کہ مومنین اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بندۂ مؤمن خدا اور رسول ﷺ کے عتاب سے بچتا رہے گا اور رحمتِ عالم ﷺ کا سچا شیدائی ہونے کا شرف پاتا رہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اجنبی عورت پر نظر پڑ جانے کے بارے میں رحمتِ عالم ﷺ سے دریافت کیا تو سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''نگاہ پھیرلو'' (مسلم شریف)

زنا کا دوسرا بنیادی سبب: زنا کا دوسرا بنیادی سبب بے پردگی اور عریانیت ہے۔ قرآن کریم نے خواتینِ اسلام کو گھروں میں رہنے اور بے پردگی سے باز رہنے کا

حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی ''(پارہ:۲۲، سورہ:احزاب، آیت:۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور بے پردہ نہ رہو جیسے اگلی جاہلیت کی بے پردگی۔

زنا کی نحوست: حضور سید عالم فخر آدم و بنی آدم ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو! زنا سے بچو اس لئے کہ زنا میں چھ خرابیاں ہیں، تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔ تین دنیا میں یہ ہیں: (۱) عزت و آبرو ختم ہو جاتی ہے۔ (۲) تنگدستی پیدا ہوتی ہے۔ (۳) عمر کم ہو جاتی ہے۔

تین آخرت میں یہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ (۲) حساب سخت ہوگا۔ (۳) جہنم کا عذاب ہوگا۔

زانی کا ایمان: بخاری و مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو مؤمن نہیں رہتا اور چور جس وقت چوری کرتا ہے مؤمن نہیں رہتا اور شرابی جس وقت شراب پیتا ہے مؤمن نہیں رہتا۔ اور نسائی کی روایت میں ہے کہ جب کوئی ان افعال کو کرتا ہے تو اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے نکال دیتا ہے۔ پھر اگر سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

زنا کے آلات: زنا کا عام مفہوم تو یہی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے بغیر باہم جنسی تعلقات قائم کرلیں۔ اسلام نے سراسر اس کو تو حرام فرمایا ہی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس کی طرف مائل کرنے والی ان تمام چیزوں پر بھی اسلام سختی سے پابندی عائد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

آنکھ کا زنا: یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کی طرف بلا عذر شرعی نظر کرے۔ **کان کا زنا:** یہ ہے کہ کسی غیر محرم کی آواز، گانے بجانے سے لطف اندوز ہو۔ **ناک کا زنا:** یہ ہے کہ کسی غیر عورت کی خوشبو سے لطف اندوز ہو۔ اسی لئے شریعت نے عورتوں کو خوشبو کا استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ **ہاتھ کا زنا:** یہ ہے کہ کسی غیر محرم کو چھوئے، ہم آغوش ہو، بوس و کنار وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ **پاؤں کا زنا:** یہ ہے کہ شہوت کے ساتھ قدم اٹھا کر کسی غیر محرم کی طرف جائے۔ **دل کا زنا:** یہ ہے کہ شہوت سے اس کی خواہش اور طمع کرے جو زنا کی لذت کو دل میں پیدا کرے۔

ثبوتِ زنا: ثبوتِ زنا یا تو چار مردوں کی گواہیوں سے ہوتا ہے یا زنا کرنے والے کے چار مرتبہ اقرار کر لینے سے۔ پھر بھی امام بار بار سوال کرے گا اور دریافت کرے گا کہ زنا سے کیا مراد ہے؟ کہاں کیا؟ کیا کیا؟ کس سے کیا؟ کب کیا؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب دے دیا یا ان سب کو بیان کر دیا تو زنا ثابت ہوگا ورنہ نہیں اور گواہوں کو صراحۃً اپنا معائنہ بیان کرنا ہوگا، بغیر اس کے ثابت نہیں ہوگا۔

زنا کی سزا: زنا کے حوالے سے قرآن پاک میں رب تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ''(پارہ:۱۸، سورہ:نور، آیت:۲) جو عورت بدکار ہو اور جو مرد تو ان میں ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: شادی شدہ مرد و عورت کے لئے رَجم (سنگسار) ہے اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے ہیں۔ (بخاری)

زنا کی گواہی میں چار مردوں کی شرط رکھی۔ چونکہ دو مرد دو عورت کے لئے دو دو گواہ ہوں تو کل چار بنیں۔ اس نازک مسئلہ میں عورت کی گواہی قبول نہیں کی گئی، چونکہ عورتیں الزام لگانے میں جلد باز ہوتی ہیں۔ یہ بھی واضح ہوا کہ جب سزا سخت ہو تو اس کے ثبوت کی شرائط بھی سخت ہوتی ہیں۔

رجم (سنگسار) کے فوائد: آج کل کئی لوگ زنا کی

اسلامی سزا رَجم (سنگسار) پر اعتراض کرتے ہیں، جب کہ رجم کرنے سے زنا جیسا حرام فعل کئی حد تک کم ہوتا ہے اور رجم کے کئی فائدے ہیں جو درج ذیل ہیں: ☆ کوئی مرد کسی عورت کو کمزور جان کر، اکیلا دیکھ کر یا غریب بے سہارا سمجھ کر اس کی عصمت و آبرو لوٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ☆ کوئی عورت جسم فروشی کو اپنا کاروبار نہیں بنائے گی۔ ☆ مرد اپنی بیوی پر توجہ زیادہ دیا کریں گے۔ بازار میں بے پردہ خواتین دعوتِ گناہ نہیں دے سکیں گی۔ نہ ہی ماڈل گرلز کو دیکھ کر خاوند بیویوں سے اُچاٹ ہوں گے۔ ☆ امیر لوگ غریب لوگوں کی بیویوں، بیٹیوں پر غلط نظر نہیں رکھ سکیں گے۔ ☆ بن بیاہی مائیں اپنے بچوں کو گندگی کے ڈھیر پر نہیں پھینک سکیں گی۔ ☆ عورت گھر میں یا سفر حضر میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھے گی۔ ☆ خاندانی حسب و نسب پر دھبہ نہیں لگے گا۔

زنا سے بچنے کے طریقے: جس طرح انسان نفس و شیطان کے فریب میں آکر زنا جیسے بدترین فعل کا مرتکب ہوتا ہے ایسے ہی اگر انسان خدا اور رسول کا خوف رکھے اور اپنے اعضا پر اسلامی قوانین کا پہرہ بٹھا دے۔ مثلاً: آنکھ، دل، ہاتھ، پاؤں وغیرہ پر اسلامی فکر کو غالب رکھے تو ایسا بندہ یقیناً گناہوں سے بآسانی بچ سکتا ہے۔ ذیل میں اس عظیم فتنہ سے بچنے کی ترکیبیں بیان کر رہے ہیں۔

☆ فتنہ زنا سے بچنے کے لئے نظروں کو نیچی رکھیں۔ ☆ عورتیں اجنبی مردوں سے نرم اور لچکدار گفتگو کرنے سے قطعاً پرہیز کریں۔ ☆ غیر محرم کی آواز، زیوروں کی جھنکار، گانے بجانے کی عادت، ایسی محفلوں سے ہمیشہ پرہیز لازم کرلیں۔ ☆ عورتیں ہرگز خوشبو نہ استعمال کریں کیوں کہ خوشبو بھی ہیجان پیدا کرتی ہے، یعنی شہوت کو ابھارتی ہے۔ ☆ عریانیت سے پرہیز کریں کیوں کہ اسلام میں لباس کی اہمیت و زینت سے زیادہ بدن کو چھپانا ضروری ہے اور وہ عورت اور مرد دونوں کو اپنے اپنے جسم کے وہ حصے چھپانا ضروری ہے جن میں جنسی کشش پائی جاتی ہے نیز عورت کو غیر مردوں سے پورا جسم چھپانا ضروری ہے۔ ☆ عریانیت سے پرہیز اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون ایسی بے حیائی کو کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ ☆ ضروری ہے کہ میاں، بیوی کو بھی کسی کے سامنے ایسے حرکات و سکنات سے پرہیز کریں جو ان کی تنہائی کی حرکتیں ہیں۔ اسلام تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ میاں، بیوی ایک دوسرے کے سامنے بلا ضرورت ننگے ہوں۔ ☆ عورتوں کو چاہئے کہ اپنا بناؤ سنگار (Makeup) چاہے وہ جسم کا ہو یا لباس کا کسی اجنبی پر کبھی ظاہر ہونے نہ دیں۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے ہفت لسانی دوروزہ عالمی سمینار کے موقع پر ڈاکٹر مختار احمد فردین کی کتاب ''اردو صحافت کل آج اور کل'' کی رسم اجرا کرتے ہوئے مولانا رحیم الدین انصاری، پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ڈاکٹر محمد نعمان، پروفیسر شاہدہ نوخیز اعظمی، پروفیسر عزیز بانو، ڈاکٹر مختار احمد فردین، حضرت رحمٰن جامی، جسٹس اسماعیل، ڈاکٹر محمد ہلال اعظمی، ڈاکٹر غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ، ڈاکٹر عارف عمری، پروفیسر فاطمہ پروین

محمد شبلی آزاد۔ایم اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

آخری خواہش

آج میگھن کا بیٹا کلّو شہر سے اپنے گاؤں واپس آرہا ہے۔وہ اپنی برادری کا اکلوتا لڑکا ہے جس نے شہر جا کر پہلے اپنی تعلیم مکمل کی اور اب وہیں رہ کر ملازمت کرتا ہے۔ پوری برادری میں خوشی کا ماحول ہے، بوڑھا باپ میگھن اس کے استقبال کے لئے چار پائی پر بیٹھا اس کی راہ تک رہا ہے۔وہ بیٹے کا انتظار بھی کررہا تھا اور اپنے بوڑھے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چلم بھی پی رہا تھا جس کے سبب پورے گھر میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔

تبھی ایک گاڑی دروازے کے سامنے آکر رکی، کلّو گاڑی سے باہر نکلا اس کے ساتھ ایک نوجوان عورت بھی تھی۔گھر میں داخل ہوتے ہی دونوں نے نمسکار کر کے میگھن کے پیر چھوئے۔ نمسکار کا جواب دیتے ہوئے میگھن نے کلو سے پوچھا تمہارے ساتھ یہ عورت کون ہے؟ کلو نے جواب دیا بابو جی یہ آپ کی بہو سویٹی ہے۔میگھن کے چہرے پر ایک سناٹا سا چھا گیا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ادھر سویٹی بھی چلم اور دھویں کا ماحول دیکھ کر دل ہی دل میں بھڑک اٹھی لیکن وہ خاموش رہی شاید اس نے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔آخر کار تیسرے دن ہی اس نے کہہ دیا کہ اگر اس گھر میں رہنا ہے تو چلم پینا بند کردو ورنہ اچھا نہیں ہوگا لیکن میگھن نے اس کی بات نہ مانی وہ سوچتا تھا کہ یہ ہمارے پرکھوں کی پرمپرا ہے اسے کیسے چھوڑ دوں۔میرے ہم عمر ساتھی آنا بند کردیں گے اگر ایسا ہوا تو میں اپنا دکھ درد کس کے ساتھ بانٹوں گا، یہ باقی بچی ہوئی عمر کیسے کٹے گی۔جب سویٹی نے دیکھا کے میگھن پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے کلّو سے شکایت کی لیکن میگھن نے کلّو کی بھی بات نہ مانی۔اب سویٹی نے میگھن کو زبانی اذیت دینی شروع کردی۔جب کلّو نہ ہوتا تو وہ میگھن کو جی بھر کر گالیاں دیتی اور برا بھلا کہتی۔

کچھ دنوں بعد کلّو کو بدیس جانے کا ویزا بھی مل گیا لیکن میگھن بالکل نہیں چاہتا تھا کہ کلو بدیس جائے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ پایا۔آخر کار وہ دن بھی آگیا جب کلّو جانے کی تیاری کرنے لگا کیونکہ اگلے ہی دن اس کی فلائٹ تھی، تیاری کرتے کرتے اسے شام ہوگئی۔ادھر میگھن برآمدے میں چار پائی پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا، نہ جانے اب اس کی زندگی کیسے پار لگے گی۔ ایک ہی تو بیٹا ہے سو وہ بھی صبح بدیس جارہا ہے، نہ جانے بہو کا برتاؤ اس کے ساتھ کیسا ہوگا وہ تو بیٹے کے سامنے بھی کھری کھوٹی سناتی رہتی ہے۔کل ہی تو اس نے کہا تھا، ان کو جانے دو پھر تمہیں بتاتی ہوں، چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا دیا تو کہنا۔کلّو کے جانے کے بعد نہ جانے میرا کیا حشر ہوگا پہلے میں جس حال میں تھا کم سے کم شان سے تو جیتا تھا اپنے بازوؤں کی طاقت سے دو وقت کی روٹی جٹا لیتا تھا کسی کے ادھین تو نہیں تھا لیکن اب تو میں ۷۰ کی عمر کو بھی پار کر چکا ہوں۔جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ ٹھیک سے کھڑا ہوسکوں۔ ہاتھ بھی کام نہیں کرتے، کچھ اٹھاتا ہوں تو پھسل کر گر جاتا ہے۔پھر اس کے بعد بہو کے تانے جو زخم پر نمک کا کام کرتے ہیں جی تو چاہتا ہے کہ مرجاؤں لیکن اس پر بھی تو میرا بس نہیں ہے کاش بھگوان مجھے اٹھا لیتا تو اس جنجال سے تو نجات پالیتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ بھگوان کو میری وپتی ہی منظور ہے۔

میگھن دکھ کے اسی سمندر میں غوطے کھا رہا تھا، اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ وہ ان خیالوں میں کچھ اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اپنے وجود کو ہی بھول گیا تھا۔ اسی حالت میں نہ جانے کب اسے نیند آ گئی لیکن یہ نیند بھی اس کے لئے کسی شراپ سے کم نہ تھی۔ خوابوں میں دکھ بھرے مستقبل کو دیکھ کر وہ چونک گیا، گھنٹوں اسی سوچ میں ڈوبا رہا جب بھی اسے بہو کا خیال آتا تو وہ سہم جاتا اور اس کا پورا جسم خوف سے کانپ اٹھتا۔ اسی حالت میں اس نے ساری رات گزار دی۔

دن نکل آیا، برآمدے میں ہلکی ہلکی سی دھوپ آنے لگی ،ادھر کلّو اپنی بی بی سے وداع لے رہا تھا۔ اتنے میں گاڑی کے ہارن کی آواز آئی ڈرائیور چلایا صاحب جلدی کریے، دیر ہو رہی ہے۔ کلو اپنا سامان لے کر کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں چارپائی پر پڑے میگھن کی طرف متوجہ ہو کر کہا بابو جی اب میں نکل رہا ہوں اپنا خیال رکھنا کسی چیز کی ضرورت ہو تو سویٹی کو آواز دے دینا۔ میگھن آنسو روکتا ہوا اپنی سہمی ہوئی کمزور زبان سے صرف اتنا ہی کہہ سکا ٹھیک ہے بیٹے بھگوان تجھے خوش رکھے، اتنا کہہ کر میگھن نے کروٹ بدل لی وہ نہیں چاہتا تھا کی اس کا بیٹا اس کی آنکھوں سے امڑتے ہوئے سیلاب کو دیکھے۔ تبھی سویٹی بول پڑی " کیوں وقت خراب کرتے ہو جی اگر فلائٹ چھوٹ گئی تو پھر نہ کہنا کہ میری وجہ سے دیر ہو گئی۔ کلّو ٹھیک ہے بھاگیہ وان! کہتا ہوا نمسکار کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی، کلو سارا سامان رکھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور کچھ ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

سویٹی کلو کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی، ادھر میگھن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سیلاب جاری تھا۔ بہت قابو کرنے کے باوجود بھی اس کی سسکیاں نہ رکیں لیکن وہ بھی کب تک روتا، اب سسکیوں کی جگہ خاموشی نے لے لی تھی۔ وقت کافی گزر چکا تھا کئی دن سے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے پیٹ اور پیٹھ ایک ہو گئے تھے لیکن سویٹی کا خوف اتنا تھا کہ وہ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ اس کو بھوک لگی ہے۔ جب بھوک کی شدت بہت زیادہ ہو گئی تو اس نے ایک ہلکی سی آواز لگائی "بہو" لیکن کوئی جواب نہیں ملا اس نے تین چار بار اسی طرح آواز لگائی لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اس بار میگھن نے ذرا تیز آواز میں کہا" بہو سنتی ہو بھوک لگی ہے کچھ کھانا ہے" سویٹی یہ سن کر غصے میں تمتماتی ہوئی آئی " کیوں گلا پھاڑتے، ہو بھوک سے مرے تو نہیں جاتے مر بھی جاتے تو اس بلا سے چھٹکارا ملتا۔ ہر وقت کھانا کھانا کرتے ہو" یہ کہہ کر سویٹی کمرے میں چلی گئی اور دو روٹیاں اور ایک گلاس پانی لا کر میگھن کے سامنے ایسے رکھا جیسے کسی جانور کے سامنے روٹی پھینک رہی ہو اور کہا" یہی بچا ہے ٹھونسنا ہے تو ٹھونسو ورنہ مرو"

" ٹھونسنا ہے تو ٹھونسو ورنہ مرو" یہ جملہ میگھن کی چھاتی میں تیر کی طرح چبھتا چلا گیا تھا۔ جی میں تو آیا کھانا اس کے منہ پر پھینک دے لیکن بھوک کے ہاتھوں مجبور تھا۔ کسی طرح اس نے ایک روٹی کھا کر پانی پیا اور ایک روٹی تکیے کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ پورا دن اسی رنج و غم کی حالت میں گزر گیا رات کے وقت بچائی گئی روٹی کھا کر اس نے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی اور پھر سو گیا۔ یوں ہی وقت گزرتا گیا۔ دن بہ دن سویٹی کی بد سلوکیاں بڑھتی گئیں اور اب تو اس نے میگھن پر ہاتھ اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو زمین پر گھسیٹ دیتی جب جی میں آیا کچھ کھانے کو دیا ورنہ کئی وقتوں تک بھوکا ہی رکھ دیا۔ سویٹی نے اس کے دوستوں کو بھی کھری کھوٹی سنا دی جس کی وجہ سے ان کا آنا بھی بند ہو گیا۔ میگھن بیچارہ کرتا بھی تو کیا اس کے ہاتھوں میں کچھ نہ تھا۔ اسے اس مصیبت سے چھٹکارے کا ایک ہی راستہ نظر آتا اور وہ راستہ موت کا راستہ تھا۔ وہ ہر وقت موت کی دعائیں کرتا لیکن دل میں یہ بھی حسرت تھی کہ مرنے سے پہلے

اپنے بیٹے کو دیکھ لوں اور اس کے بازوؤں میں ہی دم توڑ دوں لیکن نہ جانے قدرت کو کیا منظور ہے۔ ایک دن صبح کے وقت میگھن بستر پر لیٹا ہوا سامنے کی دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس میں اپنی موت کے وقت کو تلاش کر رہا ہو اچانک سویٹی کی آواز آئی "پاپا" میگھن چونک گیا سویٹی کے منھ سے یہ لفظ! اسے یقین نہیں ہوا تبھی سویٹی برآمدے میں آئی اور میگھن کے ہاتھ میں موبائل دیتے ہوئے بولی "لیجئے ان کا فون ہے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" اب وہ سب کچھ سمجھ گیا کہ اس دکھاوے کی محبت کا سبب کیا ہے۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے موبائل پکڑا، کلو کی آواز سن کر اس کی آنکھیں بھر آئیں لیکن خود پر قابو کرتے ہوئے اس نے نمسکار کا جواب دیا۔ جب کلو نے پوچھا سویٹی اچھی طرح خیال رکھتی ہے نا بابو جی؟ جی میں تو آیا کہ سارا دکھ کہہ سنائے لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی ازدواجی زندگی میں کوئی تناؤ آئے، میگھن نے صرف ہاں میں جواب دے دیا۔ ادھر سویٹی سر پر سوار تھی اسے شک تھا کہ میگھن اس کی شکایت کرے گا۔ اس نے میگھن کے ہاتھوں سے موبائل لے لیا اور کمرے میں چلی گئی۔ میگھن بستر پر پڑا ہوا پورے دن اپنے بیٹے کی یاد میں آنسو بہاتا رہا، مسلسل بھوک نے اسے پوری طرح کمزور کر دیا تھا۔ اب وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی رہ گیا تھا۔ آج پورے دن سویٹی نے نہ تو اسے گالیاں دیں اور نا ہی مارا، میگھن سوچ رہا تھا نہ جانے یہ خاموشی کون سا طوفان لانے والی ہے۔ رات کے وقت سویٹی نے میگھن کو اٹھا کر اس کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ میگھن تعجب کا پیکر بنا ہوا اس کو ایک ٹک دیکھتا رہا وہی سویٹی جو مانگنے پر بھڑک جاتی، گالیاں دیتی، مارتی آج بغیر مانگے ہی کھانا دے رہی ہے اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ اتنی بدل کیسے گئی۔ اسی کشمکش کی حالت میں میگھن نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی وہ اسی کیفیت میں گرفتار ہی تھا کہ سر چکرانے لگا پلکیں بوجھل ہونے لگیں ناک اور منھ سے خون آنے لگا۔ اب اس نے سمجھ لیا کہ سویٹی نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے آج اس نے اسے مارا کیوں نہیں۔

میگھن خوش تھا آج مدتوں بعد اس کی دعا پوری ہوتی نظر آرہی تھی، اسے مرنے کا ذرا بھی غم نہ تھا بلکہ ایک عجب سی خوشی تھی ہونٹوں پر تبسم تھا۔ وہ آج تمام مصیبتوں اور دنیا کے جنجال سے نجات پانے والا تھا اگر اسے دکھ تھا تو صرف اس کا کہ اس کی چتا کو آگ دینے والا اس کا بیٹا موجود نہیں تھا۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے خدمت اسانی دوروزہ عالمی سمینار کے موقع پر آصف ظفر ریسرچ اسکالر مانو حیدرآباد کی پہلی مرتب کردہ کتاب "مراثی وفات غالب" کی رسم اجرا کرتے ہوئے مولانا رحیم الدین انصاری، پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ڈاکٹر محمد نعمان، پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، پروفیسر عزیز بانو، ڈاکٹر مختار احمد فردین، حضرت رحمٰن جامی، جسٹس اسماعیل، غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، مولانا نعیم الدین، مفتی محمد فاروق قاسمی

عطیہ نفیس۔ایم اے۔بی ایڈ حیدرآباد

اقبالؔ کا تصورِ عشق و عقل

عشق عربی زبان کا لفظ ہے۔محبت کا بلند تر درجہ عشق کہلاتا ہے۔عشق ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔اقبال کے یہاں عشق اور ان کے مترافات ولوازمات یعنی وجدان ،خود آگہی ،باطنی شعور، جذب ،جنون دل محبت شوق ،تواتر ، انہماک سے ملتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ اقبال کے تصورات میں عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے۔اس کے متعلق اقبال کہتے ہیں کہ

عشق کی ایک جست نے طئے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

عام طور پر عقل سے رہنمائی کا کام لیا جاتا ہے۔لیکن عشق عقل سے زیادہ صاحب ادراک ہے۔

عقل و دل وںگاہ کا مرشد اولیں ہ عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدہ تصورات

اقبال کہ نزدیک عقل کی کمزوری یہ ہے۔کہ اس میں جرات، رندانہ کی کمی ہے۔جب تک عشق اس کی پشت پناہ نہ ہو آگے نہیں بڑھتی ،عام طور پر عقل سے رہنمائی کا کام لیا جاتا ہے۔لیکن عشق عقل سے زیادہ صاحب ادراک ہے۔زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی اس کو عشق اپنی کرامات سے بے سوزن اور بغیر تار رفو سی سکتا ہے۔

اقبال اگر چہ عقل کے مقابلے میں عشق کی برتری کے قائل ہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عقل کے مخالف ہیں، تاہم یہ درست ہے کہ اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں ۔کیوں کے ان کے نزدیک عشق سے ہی حقائق اشیاء کا مکمل علم بصیرت حاصل ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے خیال میں زندگی کی ساری رونق عشق سے ہے۔علم و عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتی ہے،لیکن عشق کی مدد کے بغیر منزل کو طئے نہیں کر سکتے کبھی کبھی اقبال کے ضمیر میں معرکہ ہونے لگتا ہے اور انہیں احساس ہوتا ہے ۔کہ عشق ہی حق ہے ،عقل اس کے مقابلے میں وہی درجہ رکھتی ہے جو رسولؐ پاک کے مقابلے میں ابولہب کا تھا۔

تازہ میرے ضمیر پر معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفٰی ،عقل تمام ابولہب

اقبال کے نزدیک عقل کی کمزوری یہ ہے ۔کہ اس میں جدات رندانہ کی کمی ہے۔جب تک عشق اس کی پشت پناہ نہ ہو آگے نہیں بڑھتی۔اقبال کے تصورات میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اُن کے عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے اس کے متعلق اقبال یہ کہتے ہیں کہ اُن کی نظم ''محبت'' سے ماخوذ ہے۔

تڑپ بجلی سے پائی ،حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا اس پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی ،افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزاء کو گھورا چشمہ حیوان کے پانی میں مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے عشق جو اقبال کے دائرہ فکر و فن کا مرکزی نقطہ ہے یہی تخلیق کائنات سے لے کر ارتقائے کائنات تک رموزِ فطرت کا آشنا اور کارِزار حیات میں انسان کا رہنما و کارکشا ہے۔

قول۔مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں کہ

''ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عقل وعشق دونوں خودی کا جزو ترکیبی ہیں۔عقل راز کو سمجھ کر اس کا ادراک کرتی ہے جب کہ عشق اسے انکھوں سے دیکھتا ہے۔یعنی حقیقت ہستی کا بلا واسطہ مشاہدہ کرتا ہے، ان کے خیال میں زندگی کی ساری رونق عشق سے ہے علم وعقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتی ہے۔لیکن عشق کی مدد کے بغیر منزل کو طئے نہیں کر سکتے۔

اقبال کے یہاں عشق سے مراد ایمان ہے ایمان کا پہلا جز حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقدار ہے۔اس پر شدت سے یقین اُس شدت کو صوفیاء اکرام نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔عقل ہمیں زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا حل سمجھاتی ہے عشق وایماں سے زیادہ کوئی قوی جذبہ نہیں اس کی نگاہوں سے تقدیریں مل جاتی ہیں۔اقبال کہ نزدیک عقل کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ اس کی بنیاد شک پر قائم ہے۔اس وجہ سے عقل وعلم میں وہ خواص موجود نہیں جو تربیت خودی کے لئے ضروری ہیں۔اس کے مقابلے میں عشق بے خوفی، جرات اور یقین وایمان پیدا کرتی ہے۔اس لئے عقل خدا سے صاحب جنوں ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

عقل اور عشق کی کشمکش اردو فارسی شاعری کا پرانا مضمون ہے۔عشقیہ شاعری میں عقل، مصلحت سے نا آشنا اور وضع احتیاط سے بیگانہ ہے۔ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیز ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ایسی وجہہ سے اقبال عشق کو عقل سے برتر وبلند قرار دیتے ہیں۔اگر اقبال کے تصور عشق کے بارے میں ایک فقرے میں بات کی جائے تو

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس لئے اقبال عقل کے بجائے عشق سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں اقبال کے یہاں عشق صرف اصطراری ہیجان جنسی ہوس باختہ از خود رفتگی کا نام نہیں بلکہ عالمگیر قوت حیات کا ،جذبہ عمل سے سرشایے کا ہے۔اقبال در صل عقل کے مقابلے عشق کی برتری کے قائل ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عقل کے مخالف ہیں بلکہ وہ ایک حد تک اس کی اہمیت کے قائل ہیں وعقل زمان ومکاں کی پابندی جب کہ عشق زماں ومکاں کی حدود سے نکل کر اُس عالم نامحدود میں پہنچ جاتا ہے۔جہاں حقیقت بے حجاب ہوتی ہے۔یہ محروف کا مقام ہے۔عقل کی منزل مقصود ہستی مطلق کی معرفت وہ خدا جو ہے۔لیکن اس کی جستجو نا تمام ہے، وعشق خدا نما ہے جو راہ طلب میں عقل کی رہبری کرتا ہے، گویا اقبال کے نزدیک عقل اور عشق میں بنیادی تضاد اتنا زیادہ نہیں بلکہ ابتدائی مراحل پر تو عقل کی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یہ بات بالکل درست کہی ہے۔کہ اقبال نے لفظ عشق کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں کیا ہے۔ان کے یہاں تحریر حیات ،تکمیل مقاصد،قوتِ ظہور،اور ان تمام تکوینی اور تخلیقی تعبیر ات کی وحدت لفظ ''عشق'' میں سمٹ آتی ہے۔اس لئے اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا حرکت اور عمل سمٹ آتی ہے۔لئے اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا حرکت اور عمل کو بجائے عشق استعمال کیا ہے۔اسطرح اقبال کا نظریہ عشق حیات کی وہ قوت،قوت محرکہ ہے جو ذرات کے نظام کو ایک ''نیوکولیس'' کے تحت باندھے رہتی ہے ذرات اپنے مرکز سے ایک معین دوری پر برقرار رہتے ہیں کیوں کے اس دوری کے ٹوٹنے سے ذرات کا نظام بگڑ جاتا ہے۔اسی طرح عقل کا تعلق مقاصد سے ہے۔اور عشق کا تعلق حرکت سے ہے۔عقل کی عیاری اور عشق کی سادگی اخلاص کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔.....(بقیہ،ص:۲۶پر)

ہر زبان میں ذات رسول وصفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کرنا

وقت کی اہم ضرورت: پروفیسر مظفر علی شہ میری

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام اردو مسکن حیدرآباد میں ہفت لسانی دوروزہ عالمی سمینار

بعنوان ''اردو، ہندی، عربی، فارسی، انگریزی، تیلگو، تامل نثری زبان وادب میں ذاتِ رسولؐ وصفاتِ رسولؐ'' کا انعقاد

حیدرآباد: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام ''ہفت لسانی دوروزہ عالمی سمینار'' بعنوان ''اردو، ہندی، عربی، فارسی، انگریزی، تیلگو، تامل نثری زبان وادب میں ذاتِ رسولؐ وصفاتِ رسولؐ'' اردو مسکن سالارِ ملت آڈیٹوریم خلوت روڈ، حیدرآباد میں منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کی سرپرستی پروفیسر مظفر علی شہ میری، وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول (آندھراپردیش) نے کی۔ انہوں نے کہا کہ آپؐ کے استعمال کی گئیں تشبیہات واستعارات آفاقی ہیں۔ انہوں نے سات زبانوں کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کی دیگر زبانوں میں بھی ذات رسول اور صفات رسولؐ کے حوالے سے کام کرنے پر زور دیا۔ حضرت مولانا رحیم الدین انصاری، چیرمین تلنگانہ اردو اکیڈمی نے اپنے صدارتی خطبے میں مقالہ نگران اور سمینار کے منتظمین کی تعریف کرتے ہوئے قرآن کی آیتوں کے حوالے سے ذات رسول وصفات رسول کو سمجھانے کی کوشش کی۔ افتتاحی اجلاس میں پروفیسر محمد محسن عثمانی ندوی، سابق صدر شعبہ عربی ایفلو یونیورسٹی حیدرآباد نے اپنے پرمغز کلیدی خطبے میں عربی اور اردو میں تحریر کردہ سیرت کی کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے عوام کو مطالعے کی جانب راغب ہونے کی گزارش کی۔ افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمان

پروفیسر مظفر علی شہ میری خطاب کرتے ہوئے

دائیں سے: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، حضرت رحمٰن جامی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی مولانا رحیم الدین انصاری، ڈاکٹر محمد نعمان، مفتی محمد فاروق قاسمی، ڈاکٹر محمد عارف عمری، فیض قادری پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، پروفیسر فاطمہ پروین، مولانا فہیم الدین، ڈاکٹر انظر ندوی، مولانا امداد الحق قاسمی

خصوصی استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی، پروفیسر فاطمہ پروین بیگم، جسٹس ای اسماعیل، پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈاکٹر محمد نعمان۔ چیرمین آندھراپردیش اردو اکیڈمی، مفتی محمد فاروق قاسمی، غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ اور مولانا حافظ فہیم الدین وغیرہ نے شرکت کی۔ اس ادبی جلاس میں مخصوص مقالات پیش کیے گئے جو مختلف زبانوں مثلاً اردو (ڈاکٹر محمد عارف عمری۔ فاروق طاہر)، عربی (امداد الحق قاسمی۔ انظر ندوی)، فارسی (پروفیسر عزیز بانو، انگریزی (ثمینہ یاسمین)، تامل (فیض قادری) تیلگو (مرزا جبار بیگ) ہندی (اوم پرکاش پروہت) پر مشتمل تھے۔ اس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عبدالقدوس نے انجام دی۔ اظہار تشکر ڈاکٹر مختار احمد فردین نے کیا۔ اس اجلاس میں تین کتابوں ''قوت تعلیم افکار و نظریات'' (مرتب ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی) ''اردو صحافت کل آج اور کل'' (مصنف ڈاکٹر مختار احمد فردین) ''مراثی وفات غالب'' (مرتب آصف ظفر) کی رسم رونمائی ہوئی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد عارف عمری، ممبئی اور ڈاکٹر ناظم علی نے کی۔ اس اجلاس میں ملک کی مختلف ریاستوں (اترپردیش، کشمیر، بہار، جھارکھنڈ، بنگال، مہاراشٹرا، تلنگانہ، آندھراپردیش، اور جامعات (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیوسٹی آف حیدرآباد، عثمانیہ یونیورسٹی مانو یونیورسٹی

مولانا رحیم الدین انصاری صدارتی خطاب کرتے ہوئے
دائیں سے: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، مولانا نورالعین قاسمی، اسلم فرشوری، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، عرشیہ جبین، پروفیسر محمد صدیقی محمود، ڈاکٹر محمد کاشف

ایفلو یونیورسٹی سے آئے ریسرچ اسکالرز اور ڈاکٹرس، مدارس کے فضلاء جن میں ڈاکٹر رقیہ شکیل خان (بہار) ڈاکٹر عبدالغنی (تلنگانہ) ڈاکٹر آصف لئیق ندوی (مانو حیدرآباد) ڈاکٹر محمد نوشاد (بہار) ڈاکٹر محبوب الرحمٰن (علی گڑھ) ڈاکٹر حمران احمد معروفی (حیدرآباد) ڈاکٹر سراج احمد انصاری (وردھا یونیورسٹی، ناگپور) ابوہریرہ یوسفی (مانو حیدرآباد) شبنم شمشاد (علی گڑھ مسلم نیورسٹی) عطیہ نفیس (حیدرآباد) محمد احمد نورعینی (عثمانیہ نیورسٹی حیدرآباد) ڈاکٹر غوثیہ بانو (حیدرآباد) ڈاکٹر محمد افروز نہال (مانو حیدرآباد) ڈاکٹر رفیعہ نسیم (حیدرآباد) شہزاد اختر (یونیورسٹی آف حیدرآباد) رفیعہ نوشین (حیدرآباد) عابد حسین گناتی (مانو حیدرآباد) آصفہ شمیم (حیدرآباد) شبانہ (حیدرآباد) عبدالرقیب (مانو حیدرآباد) محمد عامر مجیبی (مانو حیدرآباد) محمد عاطف عمران (مانو) محمد ارشاد، محمد نواز (ایفلو) عبدالخالق (ایفلو) فریدہ بیگم (عثمانیہ) نفیسہ فاطمہ (عثمانیہ) دردانہ بیگم (عثمانیہ) سیدہ مریم غزالہ (عثمانیہ) نشاط فاطمہ (عثمانیہ) نے اپنے پرمغز مقالات پیش کئے۔ جو فت لسانی عربی، اردو، فارسی، تیلگو، ہندی اور انگریزی پر مشتمل تھے۔ اس سیشن کے صدور اجلاس، مہمانان خصوصی اور سامعین نے سراہا اور مقالہ نگاران کی تعریف کی۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر غوثیہ بانوں نے انجام دی۔ ڈاکٹر سمیہ تمکین نے اظہار تشکر کیا۔

تیسرے اور آخری اجلاس اکیڈمک سیشن میں سرپرستی پروفیسر مظفر علی شہ میری اور صدارت مولانا رحیم الدین انصاری نے کی۔ پروفیسر محمود صدیقی محمد، اسلم فرشوری، ڈاکٹر عرشیہ جبین اور ڈاکٹر محمد کاشف وغیرہ نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی اور خطاب بھی کیا۔ اس سیشن میں ڈاکٹر مصلح الدین نظامی (حیدرآباد) ڈاکٹر محمد نصیرالدین منشاوی (انوارالعلوم ڈگری کالج حیدرآباد) ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد (حیدرآباد) (لکھنؤ) ڈاکٹر نوری خاتون (حیدرآباد) ڈاکٹر کفیل احمد خان (حیدرآباد) ڈاکٹر جرار احمد (مانو حیدرآباد) ڈاکٹر سید عمر فاروق (مانو حیدرآباد) خیرا لنساء علیم (حیدرآباد) مجتبیٰ فاروق (مانو حیدرآباد) تبسم آراء (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) شیخ شہباز (تروپتی یونیورسٹی) محمد عدنان (مانو حیدرآباد) شفیع الرحمٰن (ایفلو یونیورسٹی حیدرآباد) وسیم احمد بلال احمد (مانو حیدرآباد) سید محبوب قادری (حیدرآباد) نہاں نوری (یونیورسٹی آف حیدرآباد) روحینا فاطمہ سحر (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) محمد انتخاب عالم (مانو حیدرآباد) وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کئے۔

جس کی خوب ستائش ہوئی۔ مہمانوں نے شبلی انٹر نیشنل کے چیرمین ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی اور ٹرسٹیز کو ایک تاریخ ساز کامیاب پروگرام کے انعقاد کے لیے مبارک باد پیش کی۔ اختتامی پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سراج احمد انصاری نے کی۔ اظہار تشکر سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے کیا۔ ٹرسٹیز و معاونین میں ڈاکٹر عبدالقدوس، ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر سید حبیب امام قادری، ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، مساعد ہلال احیائی، ابوہریرہ یوسفی، ثمینہ یاسمین، محمد وقار حسامی، صوفی عقیل احمد انصاری، منہاج العابدین، مولانا اکرام الدین کانکرتوی وغیرہ نے شرکت کی۔

ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

نام کتاب: ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ظفر الاسلام

مبصر: ثناغزل، ریسرچ اسکالر شعبۂ بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

صفحات: ۱۴۳

قیمت: ۱۶۰ روپے

ظفر الاسلام کی پہلی تصنیف ''ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' اتر پردیش کے ضلع مئو کے شاعروں سے شناسائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ مئو کے شعرا نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ میدان شعروادب میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں اسے کتاب میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں علاقائی ادب کو یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، لیکن مصنف نے علاقائی ادب کو اپنا موضوع بنایا ہے چنانچہ ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

''اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ چھوٹے شہروں اور قصبات میں نثر نگار ملیں یا نہ ملیں، لیکن شاعر ضرور مل جائیں گے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر علاقے میں کچھ نہ کچھ اچھے شاعر ہوتے ہیں لیکن بہ وجوہ ان کے کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر نہیں آپاتے لہٰذا مقامی اور علاقائی ادب (نثر و نظم) کو سمیٹے بغیر کسی ریاست کی ادبی تاریخ کا کام صحیح طور پر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے اپنے علاقے کے شاعروں پر کام شروع کیا۔ مطالعے کے دوران مجھے بہت سے ایسے شعرا اور ان کے کلام سے واقفیت حاصل ہوئی جن میں اکثر شعرا کے شعری مجموعے اب تک شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ (ص ۱۹)

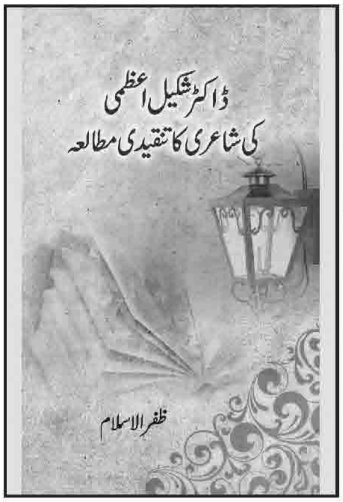

کتاب کے شروع میں پروفیسر مظفر علی شہ میری نے پیش گفتار تحریر کیا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ظفر الاسلام نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ انھوں نے شاعر کے تعلق سے تحقیق کی ہے اور اس کی شاعری کے تعلق سے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ میں ظفر الاسلام کو ان کی پہلی تصنیف پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔'' (ص، ۱۰)

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے رقم کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کے متعلق وہ اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' عزیزی ظفر الاسلام کی ابتدائی کوشش ہے۔ جس میں حمد، نعت، منقبت، غزل اور نظم کا مطالعہ پیش کیا گیان ہے، اس مختصر مقالے میں متعلقہ موضوعات پر سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بشرط محنت و کوشش یہ جوہر قابل مستقبل میں میدان تحقیق کا شہ سوار بن سکتا ہے اور فکر و تحقیق کی دنیا کو کچھ دے سکتا ہے۔'' (ص، ۱۸)

زیر نظر تصنیف کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب 'ڈاکٹر شکیل اعظمی حیات اور شخصیت' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں شکیل اعظمی کی مکمل زندگی، ان کی تخلیقات اور اعزازات کا ذکر ہے۔ دوسرا باب 'معاصر شعرا' کے بیان میں ہے جس میں مندرجہ ذیل شعرا کے مختصر حالات، تعلیم و تصنیف اور نمونہ کلام شامل ہے۔ فضا ابن فیضی، اثر انصاری، علامہ بدر القادری بدر، مولانا سیف الدین انصاری، نثار کریمی، اقبال اعظمی، مضطر اعظمی، علی حسن گلشن، ڈاکٹر منور انجم، وہمی رحمانی، سردار شفیق، ناصر انصاری، ماہر انصاری۔ تیسرے باب میں ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شعری اصناف اور ان کی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں نعت، منقبت، نظم اور غزل جیسی صنف کا مختصر تعارف بیان کیا گیا ہے۔ نعت کے متعلق لکھتے ہیں:

''نعت گوئی میں جہاں حضور کی سیرت و کردار، عادات و خصلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہیں جنگ کے واقعات کی تفصیل، معراج النبی کا بیان، معجزات کا ذکر مثلاً کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا، سورج کا دوبارہ نمودار ہونا وغیرہ کا ذکر بھی اکثر شعرا کرتے ہیں۔ شکیل اعظمی نے بھی ان مضامین کو اپنی نعت میں سمیٹا ہے'' ص ۷۶

جملہ اصناف میں غزل کا مطالعہ زیادہ گہرائی و گیرائی سے کیا گیا ہے۔ اشعار پر موضوعات کے تحت تنقیدی رائے قائم کی گئی ہے تا کہ اس کی باریکیاں سمجھنے میں آسانی ہو۔ بعض اشعار کا پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے لیے یہ اشعار ملاحظہ کریں:

بھٹک نہ جائے مسافر کہیں اندھیرے میں
چراغ کوئی سر رہ گزر جلاتے رہو

شکیلؔ اس کو مرادوں کی رات مل جائے
چراغ جس نے سر رہ گزر جلایا ہے

''مندرجہ بالا اشعار کا موضوع مولانا الطاف حسین حالیؔ کی نظم ''مٹی کا دیا'' سے ماخوذ ہے۔ جس میں ایک بڑھیا راہ میں دیا روشن کرتی ہے تا کہ راہگیروں اور پردیسیوں کو ٹھوکر نہ لگے اور ہر چھوٹا بڑا آسانی سے راہ سے گزر جائے۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ یہ مٹی کا دیا ان جھاڑوں اور فانوس سے بہتر ہے جن کی روشنی محض محلوں تک محدود ہے۔ اسی مضمون کو شکیلؔ اعظمی نے ان دو شعروں میں پیش کیا ہے۔'' (ص ۱۱۲)

بقول مصنف شکیل اعظمی بنیادی طور پر حسن عشق کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی حسن عشق کے ساتھ سیاسی، تہذیبی و معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ بعض غزلوں میں معاشرے میں پھیلی ہوئی برائی، ناانصافی اور رشتوں کی پامالی کا ذکر احتجاج کے طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً:

خوش لباسوں کو تو آتی نہیں اس وقت بھی شرم
ان کے در پر جو کوئی ننگے بدن آتا ہے

خیال بیٹوں کو ماں باپ کا تو ہے لیکن
کہاں وہ جذبۂ خدمت جو بیٹیوں میں ہے

'آشوب آگہی' شکیل اعظمی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں جن نظموں پر گفتگو کی گئی ہے ان کے نام یہ ہیں، ''نوائے علم، حرف نصیحت اور جشن غالب'' ان کے ذریعہ شکیل اعظمی کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

یہ سال اپنی ملاقات کا ہے آخری سال
پھر اس کے بعد نہ جانے ہو کیا ہمارا حال
ہر ایک لمحہ محبت کا بیش قیمت ہے
جو لمحہ ساتھ میں گزرے بہت غنیمت ہے

کتاب کے اخیر میں شکیل اعظمی کا انٹرویو شامل ہے۔ جو مصنف نے مارچ ۲۰۱۷ء میں ان کے آبائی مکان گھوسی میں لیا ہے۔

یہ ظفر الاسلام کی پہلی کاوش ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعہ قاری کو کچھ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں پی ایچ۔ ڈی (اردو) کے اسکالر ہیں۔ ہم ان کے روشن مستقبل کی دعا کرتے ہیں۔

عطا کرے گا تمہیں سر بلندیاں اک دن
خدا کے سامنے بس اپنے سر جھکاتے رہو
(شکیل اعظمی)

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India